احمد حسین مجاہد کی شاعری: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

(مقالہ برائے ایم فل اُردو)

مقالہ نگار:

محمد قدیر

شعبۂ اُردو

ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ

۲۰۲۲ء

ڈاکٹر الطاف یوسفزئی

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ اُردو، ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ

موبائل نمبر: ۰۳۴۵-۹۳۷۰۲۷۵

altafokasha@gmail.com

تاریخ:____________

حوالہ:____________

تصدیق نامہ

میں تصدیق کرتا ہوں کہ مسمی محمد قدیر نے ایم فل (اُردو) کی سند کے حصول کے لیے مقالہ بہ عنوانِ **"احمد حسین مجاہد کی شاعری: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ"** میری نگرانی میں لکھا ہے۔ یہ مقالہ ہائیر ایجوکیشن کمیشن کے مروّجہ طریقہ کار کے مطابق تحریر کیا گیا ہے۔ میں اس کے معیار سے مطمئن ہوں اور اسے اگلے امتحانی مراحل کے لیے پیش کرنے کی سفارش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر محمد الطاف یوسف زئی

شعبۂ اُردو

ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ

Author's Declaration

I, Muhammad Qadeer, hereby states that my M Phil thesis titled

"احمد حسین مجاہد کی شاعری: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ""

is my own work and has not been submitted previously by me for taking my degree from Hazara University Mansehra or anywhere else in the country/abroad. At any time, if my statement is found to be incorrect even after my Graduate, the university has the right to withdraw my M Phil.

Name: Muhammad Qadeer

Date: ________________________

Supervisor Signature

Plagiarism Undertaking

I solemnly declare that research work presented in the thesis titled

"احمد حسین مجاہد کی شاعری: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ"

solely my research work with no significant contribution from any other person. Small contribution/ help wherever taken has been duly acknowledge and that complete thesis has been written by me.

I understand the zero tolerance policy of the HEC and Hazara University, Mansehra towards Plagiarism. Therefore, I, as an author of the above titled thesis, declare that no portion of my thesis has been plagiarized and any material used as reference is properly referred/cited.

I undertake that if I am found guilty of any formal plagiarism in the above tattled thesis even after award of M Phil degree, the university reserves the rights to withdraw/ revoke my M Phil degree and that HEC and the University has the right to publish my name on the HEC / University website in the list of those students who submitted plagiarized thesis.

Student / Author's________________________

Name: Muhammad Qadeer

Supervisor: ______________________

فہرست

دیباچہ

صوبہ خیبر پختونخواہ سرسبز و شاداب ہونے کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی مرکز کا گہوارہ بھی ہے جہاں گوناں گوں ادبی شخصیات اُردو زبان وادب کی آب یاری کر رہے ہیں ان میں ایک نام احمد حسین مجاہد کا نمایاں نظر آتا ہے جو غزل اور نظم کی روایت کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان کی شاعری مختلف موضوعات سے بھری پڑی ہے۔اسی بناپر ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ (پاکستان) نے مجھے یہ مقالہ برائے ایم فل اُردو "احمد حسین مجاہد کی شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" کے موضوع پر تحقیقی کام کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔

زیرِ نظر مقالے میں احمد حسین مجاہد کے سوانح و شخصیت کے علاوہ ان کی شاعری کے فکری وفنی عناصر کا مختصر مگر جامع مطالعہ کیا گیا ہے جن میں ان کی غزلیات اور نظموں میں ان حالات و واقعات کو بیان کیا ہے جو سماجی، سیاسی، معاشی و معاشرتی مسائل کی نشان دہی کرتے ہیں۔ راقم نے احمد حسین مجاہد کی شاعری کے تمام پہلوؤں کو بالتفصیل پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس میں شاعر کی شاعری کو بطورِ حوالہ پیش کر کے ایجاز و اختصار کے ساتھ ان کی شاعری کا فکری وفنی جائزہ لیا گیا ہے۔اس امر کے لیے راقم نے مقالہ رقم کرنے کے لیے ثبوت و دلائل اکٹھے کیے ہیں جن کی روشنی میں مقالہ نگار نے بغیر کسی لگی لپٹی کے بالکل سادہ، آسان اور سلیس عبارت سے کام لیتے ہوئے اپنے موضوع کو تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اس موضوع پر کی جانے والی تحقیق دستاویزی ہے۔ جس میں مختلف حوالوں کے ذریعے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ احمد حسین مجاہد کی شاعری کن موضوعات پر بحث کرتی ہے اور ان کا لطیف پیرائیہ کس قدر پختہ و مستحکم ہے۔اس ضمن میں ان کی شاعری کے مجموعات "دھند میں لپٹا جنگل" اور "اوک میں آگ" سے اشعار بطورِ نمونہ پیش کیے گئے ہیں۔

راقم نے مقالہ ترتیب دیتے ہوئے اس کو مختلف چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں

شاعر کی زندگی کے حالات و آثار کو پیدائش سے تاحال بیان کیا ہے اور ساتھ ہی ان کی تصانیف کا مختصر جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ باب دوم میں احمد حسین مجاہد کی شاعری کا فکری مطالعہ کرتے ہوئے ان کے نت نئے مضامین اور عصری مسائل کا تذکرہ کیا ہے۔ تیسرے باب میں احمد حسین مجاہد کی شاعری کو فنی جہت سے ہم کنار کیا ہے، جس میں ان کی خوب صورت تشبیہات و استعارات اور اسلوبِ بیان کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ چوتھے اور آخری باب میں بحیثیتِ مجموعی شاعر کے حالات و آثار کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کے فکری عناصر اور فنی کمالات کو مختصر مگر جامع انداز میں رقم کیا ہے۔

یہ مقالہ شعبۂ اُردو ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ کے چیئرمین پروفیسر ڈاکٹر محمد الطاف یوسفزئی کی نگرانی میں پایۂ تکمیل تک پہنچا جنھوں نے مقالے کی کانٹ چھانٹ اور کمی بیشی کو پورا کرتے ہوئے کمال شفقت سے میری رہنمائی کی۔ اس کے علاوہ جملہ ڈاکٹر صاحبان جن میں سابقہ صدر نشین شعبۂ اُردو ڈاکٹر نذر عابد، ڈاکٹر محمد رحمان اور ڈاکٹر مطاہر شاہ کا تہہ دل سے ممنون ہوں جنھوں نے مقالے کی تسوید و تبیض میں ہر گام میری رہنمائی فرمائی۔

خصوصی طور پر احمد حسین مجاہد اور ان کے اہلِ خانہ کا جتنا شکریہ ادا کیا جائے کم ہے کیوں کہ انھوں نے مجھے اپنا قیمتی وقت دینے کے علاوہ مختلف دستاویزوات اور رسائل و جرائد فراہم کیے۔

اپنے اس تحقیقی کام کے سلسلے میں اپنے تمام دوست احباب کا شکریہ ادا کروں گا جنھوں نے ہر مشکل گھڑی میں میرا بھرپور ساتھ دیا اور مجھے ہر طرح کی مشکلات سے بعید رکھتے ہوئے مجھے حوصلہ دیا۔ ان دوست احباب میں محترم عمار فراز، شمس الدین، شاد محمد، شباہت عمر فاروق اسسٹنٹ پروفیسر آرمی برن ہال اور محترمہ عنیقہ انور شاہ صدر شعبۂ اُردو آرمی برن ہال کا نام لینا میرے لیے قابلِ فخر ہے۔

آخر میں، میں اپنے والدین اور اہلِ خانہ کا بھی شکریہ ادا کروں گا جن کی دعاؤں کی بدولت میں زندگی کے ہر میدان میں کامیابی و کامرانی سے ہم کنار ہوتا ہوں۔ خصوصاً والدِ محترم اور والدہ محترمہ نے

مجھے وقت کے تند و تیز آندھیوں کے سامنے ڈٹ جانے کا حوصلہ و گر سکھایا اور حوصلہ دیتے ہوئے میرا یہ تحقیقی کام اپنے اختتام کو پہنچانے میں ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔

آخر میں اپنے مقالہ کے کمپوزر حافظ عاصم محمود کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے بروقت کمپوزنگ کا فریضہ نبھایا۔ بارگاہِ رب العزت میں سر بسجود ہو کر شکر ادا کرتا ہوں کہ جس کے لطف و کرم اور خصوصی عنایات سے مقالہ ہذا بخیر و خوبی تکمیل کے مراحل تک پہنچا۔

محمد قدیر

ایم فل اسکالر

باب اول

احمد حسین مجاہد: سوانح و شخصیت

۱.۱ خاندانی پس منظر

ہزارہ کی سرسبز و شاداب سرزمین جہاں اپنی شادابی کی وسعتوں کو چھو رہی ہے وہاں ساتھ ساتھ ادب کو بھی فروغ مل رہاہے۔ اُردو زبان وادب کے حوالے سے بہت سی ایسی شخصیات ہیں جو نہ صرف نثر بلکہ شاعری میں بھی فعال کردار ادا کر رہی ہیں، ان میں ایک اہم اور معتبر شخصیت احمد حسین مجاہد بھی ہیں۔

احمد حسین مجاہد کا تعلق ضلع مانسہرہ کے ایک تاریخی قصبے (تحصیل بالاکوٹ) سے ہے۔ آباؤ اجداد کا تعلق سرخیلی یوسف زئی پٹھان قبیلے سے ہے۔ والد کا نام غلام حسین تھا، جو ایک عمدہ شاعر اور بہترین ناول نگار بھی تھے۔ ان کے والدِ محترم اپنی تخلیق کاری کی وجہ سے اپنا تخلص بیکسؔ استعمال کرتے تھے۔ انھوں نے ایک ناول "مقدر" بھی لکھا ہے۔ پیشے کے اعتبار سے مدرس تھے۔ خوش اخلاق اور خوش مزاج شخصیت کے مالک تھے۔ ایک انٹرویو کے دوران احمد حسین مجاہد کہتے تھے:

> "والدِ محترم غلام حسین بیکسؔ درویش منش اور ہمدرد انسان تھے۔
> ہمیشہ دوسروں کے کام آتے تھے۔ اپنے فرائضِ منصبی خود نبھاتے
> اور کبھی کسی کو ایسی نصیحت نہیں کی جس سے کسی کی ذاتی زندگی میں
> مداخلت ہوتی ہو۔" (۱)

احمد حسین مجاہد کا تعلق ایک علمی و ادبی گھرانے سے تھا۔ اس لیے اُن کی شخصیت پر یہ رنگ غالب آیا۔ ان کی والدہ ماجدہ مہربان اور انتہائی نرم مزاج خاتون تھیں۔ گھر کا ماحول سادہ اور بے تکلفانہ تھا۔ گھر کے معاملات اور لین دین کی ذمہ داریاں والدہ ہی سنبھالتی تھیں۔ اس حوالے سے احمد حسین مجاہد نے کہا:

> "گھریلو معاملات کو خود سنبھالتی تھیں۔ ہمیشہ صبر و تحمل سے کام

لیتی تھیں۔ میں نے اپنی ماں جیسی صابر و شاکر خاتون ابھی تک نہیں دیکھی ۔آپ صوم و صلوٰۃ کی پابند اور تہجد گزار خاتون تھیں۔"(۲)

احمد حسین مجاہد اپنے والدین کی انتھک محنتوں اور کاوشوں کی وجہ سے ہزارہ کے نمائندہ مجاہدوں میں شمار ہونے لگے اور تاریخی قصبے بالاکوٹ کے "فرزندِ بالاکوٹ" کے لقب سے مشہور ہوئے۔

۱.۲ پیدائش

احمد حسین مجاہد ۲ مارچ ۱۹۶۱ کو بالاکوٹ میں پیدا ہوئے۔ دستاویزات اور تاریخی ریکارڈ میں آپ کی تاریخ پیدائش یہی درج ہے جب کہ پروفیسر بشیر احمد سوزؔ اور پروفیسر ایوب صابر نے اپنی تصنیفات میں ان کی تواریخ کچھ یوں درج کی ہیں۔ پروفیسر بشیر احمد سوزؔ نے "ہزارہ میں اُردو زبان و ادب کی تاریخ" میں لکھا ہے:

"احمد حسین مجاہد ۲۳ اگست ۱۹۵۹ کو بالاکوٹ ضلع ہزارہ میں پیدا ہوئے۔"(۳)

پروفیسر ایوب صابر نے اپنی تصنیف "ادبستان ہزارہ" میں احمد حسین مجاہد کی تاریخِ ولادت اور جائے پیدائش کے متعلق یوں بیان کیا ہے:

"احمد حسین مجاہد ۲۳ اگست ۱۹۵۹ کو بالاکوٹ میں پیدا اگست 22 ہوئے۔"(۴)

تحصیل بالاکوٹ علمی، ادبی اور تاریخی لحاظ سے اہمیت کا حامل قصبہ ہے۔ یہ قصبہ اب شہر کی صورت اختیار کرتا جارہا ہے، جس میں وسیع پیمانے پر علمی و ادبی تحریکیں وسیع و عریض پیمانے پر پھیلتی جارہی ہیں۔ تاریخی حوالے سے یہ حصہ جنت نظیر کا منظر پیش کرتا ہے جس میں گنگناتی

آبشاریں، بل کھاتا دریا، خاموش پہاڑ، سرسبز و شاداب لہلہاتے کھیت اور اس سے بڑھ کر سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کے تاریخی مقبرے اس قصبے کا حصہ ہیں۔ ایک انٹرویو کے دوران احمد حسین مجاہد نے راقم کو بتایا:

"سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ جب بالاکوٹ آئے تھے اس وقت بالاکوٹ میں دو مساجد تھیں۔ ایک کو مسجد بالا اور دوسری کو مسجد زیریں کہا جاتا تھا۔ وجہ اُس کی یہ تھی کہ مسجد بالا دریا کے کنارے ایک چھوٹی سی پہاڑی پر بنی ہوئی تھی جب کہ مسجد زیریں پہاڑی کے دامن میں واقع تھی۔ مسجد زیریں ہمارے محلے کی مسجد ہے جو آج بھی موجود ہے اور اسی مسجد میں سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ نماز بھی پڑھا کرتے تھے اور جنگی حکمتِ عملی بھی طے کیا کرتے تھے۔ میں اسی تاریخی محلے میں پل بڑھ کر جوان ہوا۔"(۵)

تحصیل بالاکوٹ علمی و ادبی حوالے سے بھی اہم ہے۔ اس قصبے سے تعلق رکھنے والوں میں ہارون الرشید، اختر زمان اختر اور منور احمد منور شامل ہیں۔

۱.۳ تعلیم و تربیت

احمد حسین مجاہد بچپن ہی سے بہت ذہین تھے۔ اپنی ذہانت کی وجہ سے انھوں نے بہت جلد ہی محلے کی مسجد سے قرآن کریم کا ناظرہ مکمل کیا۔ اسی اثنا میں انھوں نے گورنمنٹ پرائمری سکول بالاکوٹ سے ۱۹۷۳ء میں ابتدائی تعلیم مکمل کی۔ اپنی ابتدائی تعلیم کے متعلق احمد حسین مجاہد نے بتایا:

"ہماری تعلیم کا زمانہ انتہائی سادہ تھا۔ میں بہت ذہین تھا۔ جس کی وجہ سے اپنی جماعت میں ہمیشہ اوّل آتا تھا۔"(۶)

احمد حسین مجاہد نے گورنمنٹ ہائی اسکول بالاکوٹ سے میٹرک کا امتحان ۱۹۷۷ء میں پاس کیا۔ اس زمانے میں اُنھوں نے بالاکوٹ بلکہ وادیٔ کاغان کے سب اسکولوں میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔

۱۹۸۳ میں احمد حسین مجاہد نے زرعی یونیورسٹی پشاور سے "سوشل سائنسز" میں بی ایس سی آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ اُس وقت یہ یونیورسٹی فیکلٹی کا درجہ رکھتی تھی۔ ۱۹۹۵ء میں نیشنل انسٹیٹیوٹ آف جرنلزم اسلام آباد سے سندِ صحافت امتیازی نمبروں کے ساتھ حاصل کی اور پورے پاکستان میں تیسری پوزیشن اپنے نام کی۔

احمد حسین مجاہد کا تعلیمی سفر اور کتب کا مشاہدہ محدود نہیں تھا بلکہ انھوں نے ۲۰۱۳ء میں ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ سے ایم اے اُردو کا امتحان پاس کیا۔ کتب سے شغف اور مطالعہ ان کا فطری عمل ہے جس کی بنا پر وہ زندگی کے ہر موڑ میں کامیابیوں سے ہم کنار ہوئے۔ اپنے تعلیمی سفر کے حوالے سے احمد حسین مجاہد یوں گویا ہیں:

> "میرے تعلیمی سفر میں میرے والدین اور اساتذہ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ والدین کی محبت اور اساتذہ اکرام کی محنت اور حوصلہ افزائی نے مجھے وہ مقام دیا جس کا بیان کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ مگر مجھے اپنی تعلیم کا ابتدائی زمانہ اچھی طرح یاد ہے۔ میں سمجھتا ہوں میرا وہ وقت میرے لیے مشعلِ راہ بن کر آیا اور مجھے اس مقام پر لا کھڑا کیا۔"(۷)

تعلیمی سفر میں احمد حسین مجاہد کی رفتار کچھ زیادہ تو نہ تھی لیکن گاہے گاہے وہ اپنا تعلیمی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں اور بغیر کسی رکاوٹ کے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔

احمد حسین مجاہد کی علم دوستی کا یہ واضح ثبوت ہے کہ وہ ہر وقت مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ ناول اور افسانے پڑھتے رہتے ہیں۔ خصوصاً شاعری کی کوئی نہ کوئی کتاب سامنے پڑی رہتی ہے۔ اسی وجہ سے اُن کے پاس علم کے وسیع ذخائر موجود ہیں۔ احمد حسین مجاہد کے علمی مرتبے کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر نذیر تبسم لکھتے ہیں:

> "صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخواہ) کے انتہائی دور دراز لیکن خوب صورت ترین علاقے وادئ کاغان سے تعلق رکھنے والا یہ صاحب مطالعہ شاعر ڈگری یافتہ ہی نہیں تعلیم یافتہ بھی ہے"۔(۸)

۱.۴ آغازِ شاعری

احمد حسین مجاہد کو بچپن ہی سے شعر وادب سے لگاؤ تھا۔ یہ بات درست ہے کہ شاعر پیدائشی ہوتا ہے اور مکتبِ زمانہ اس کی نوک پلک سنوارتا ہے۔ وہ جذبات اور احساسات کو پیکر اظہار کرنے کا قصد کرتا ہے۔ احمد حسین مجاہد بھی پیدائشی شاعر ہے۔ زمانۂ طالبِ علمی ہی میں شعر گوئی کی ابتدا ہوئی۔ بلکہ ایک انٹرویو میں انھوں نے بتایا:

> "میری عمر دو سال کی تھی کہ والدہ بیمار پڑ گئیں۔ مظفر آباد ہسپتال میں جب ہم گئے تو میں لوگوں کو دیکھ کر خوف زدہ سا ہو گیا اور رونے لگا۔ نرسوں نے بہت کوشش کی مگر میں روتا ہی چلا گیا۔ آخر کار کہیں سے نرسوں نے میرے ہاتھ میں کتاب تھما دی۔ والدہ کا کہنا تھا کہ کتاب کا میرے ہاتھ لگتے ہی میں اس کے ورق الٹنے لگا اور ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے میں کبھی رویا ہی نہیں۔"(۹)

اگرچہ یہ ایک غیر شعوری واقعہ ہے لیکن آگے چل کر احمد حسین مجاہد مجاہد نے یہ ثابت کیا کہ انھیں واقعی کتب سے والہانہ لگاؤ ہے۔ ساتھ ساتھ گھر کا ماحول بڑا علمی و ادبی تھا۔ والد گرامی

مدرس، شاعر اور ناول نگار تھے۔ گھر میں ایک کتب خانہ تھا، جس میں ہر قسم کی ادبی اور تاریخی کتب کے علاوہ ڈائجسٹ موجود تھے۔ گھر کا سازگار ماحول اور مطالعے کا شوق ہی ان کو احمد حسین سے احمد حسین مجاہد بناتا ہے۔ انھوں جب شاعری کا آغاز کیا تو والد نے ان کا تخلص "مجاہد" تجویز کیا لیکن انھوں نے "احمدؔ" کے تخلص کو ہی برقرار رکھا۔ اس حوالے سے پروفیسر ایوب صابر لکھتے ہیں:

"ان کے والد غلام حسین بیکسؔ بھی شعر گوئی سے دل چسپی رکھتے تھے۔ احمد حسین مجاہد کا تخلص انھوں نے "مجاہد" تجویز کیا۔ یہ لفظ ان کے نام کا حصہ تو بن گیا لیکن تخلص کے طور پر وہ لفظ "احمدؔ" استعمال کرتے ہیں۔"(۱۰)

احمد حسین مجاہد نے پرائمری اسکول سے ہی شاعری کا آغاز کر دیا تھا۔ والد کے لکھے گئے ناول "مقدر" کی جلد بندی کرتے ہوئے اس پر ایک لڑکی کی تصویر بنائی، موم بتی بنائی اور ساتھ ہی اپنا ایک شعر لکھا جس میں لفظ "مقدر" بھی آیا۔ بچپن میں کہے گئے اشعار میں سے وہی ایک شعر جو یاد ہے باقی بھول چکے ہیں۔ اسکول کے زمانے میں کہا گیا کلام بہت زیادہ تھا مگر خذف کر دیا گیا۔

ابتدا میں شعرا کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا جس میں احمد فرازؔ سرِ فہرست ہیں۔ احمد فرازؔ کی شاعری سے متاثر ہوئے اور شاعری کی طرف رجحان مزید آگے بڑھا۔ دورانِ تعلیم زرعی یونیورسٹی پشاور میں نامور شعرا اور ادبا کی صحبت میسر آئی۔ شعر گوئی کا جذبہ اتنا تھا کہ شعبۂ اُردو پشاور یونیورسٹی تشریف لے جاتے وہاں نذیر تبسمؔ اور خاطرؔ غزنوی جیسے لوگوں سے ملاقات ہوتی۔ ساتھ ساتھ اسلامیہ کالج پشاور موجودہ(اسلامیہ کالج یونیورسٹی) پشاور جایا کرتے تھے ۔اس حوالے سے احمد حسین مجاہد نے دورانِ انٹرویو راقم کو بتایا:

"میں پشاور یونیورسٹی اور اسلامیہ کالج پشاور جایا کرتا تھا۔ اسلامیہ کالج میں پروفیسر محسن احسان اور اشرف بخاری سے شرفِ ملاقات

رہا، جن کی صحبتوں نے میرے اندر کے فن کار کو جِلا بخشی۔
شاعری میں، میں نے باقاعدہ کسی کی شاگردی تو اختیار نہیں کی البتہ
انھی لوگوں سے اصلاح اور مشورے لیا کرتا تھا۔"(۱۱)

احمد حسین مجاہد نے اپنی زندگی کا پہلا مشاعرہ ۱۹۷۸ء کو شعبۂ اُردو پشاور یونیورسٹی میں پڑھا۔ اس مشاعرے میں اُردو کے نامور شعرا خاطرؔ غزنوی اور ڈاکٹر نذیر تبسمؔ بھی موجود تھے۔ ۱۹۸۳ء میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایبٹ آباد زرعی ترقیاتی بنک میں بطور ملازم بھرتی ہوئے۔ اس دوران ایبٹ آباد میں ہونے والے مشاعروں میں شرکت کی، جس کی وجہ سے ان کا شمار ہزارہ کے نامور شعرا میں ہونے لگا۔ ایبٹ آباد میں ان کی ملاقات نیاز سواتی مرحوم سے ہوئی۔ ساتھ ساتھ سعید نازؔ، امتیاز الحق امتیازؔ، آصف ثاقبؔ، شعیب آفریدیؔ، عامر سہیلؔ، سید ابرار سالکؔ، سلطان سکونؔ، حفیظ اثرؔ، ڈاکٹر عاکف اللہؔ، واحد سراجؔ، پروفیسر یحییٰ خالدؔ اور ڈاکٹر ایوب صابرؔ جیسے لوگوں سے نہ صرف متعارف ہوئے بلکہ ان سے مراسم بھی بڑھے۔ انھیں ایبٹ آباد کی ایک ادبی تنظیم "بزمِ اہلِ قلم" کا پلیٹ فارم میسر آیا جس کے صدر حفیظ اثرؔ اور جنرل سیکرٹری نیاز سواتیؔ مرحوم تھے۔ اس طرح اُن کی شاعری کا باقاعدہ آغاز دورانِ ملازمت ایبٹ آباد سے ہوا۔

۱.۵ ملازمت کا آغاز

احمد حسین مجاہد نے بی ایس سی آنرز کرنے کے فوراً بعد ۱۹۸۳ء میں زرعی ترقیاتی بنک میں ملازمت کا آغاز کیا۔ اس کے بعد اُن کا تبادلہ ۱۹۹۸ء میں مظفر آباد میں ہوا اور وہاں آٹھ (۸) سال تک خدمات انجام دیتے رہے۔ اپنی اس ملازمت کے تجربات و مشاہدات کو احمد حسین مجاہد نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"میری زندگی میں بینک کی ملازمت ایک نئی تبدیلی لائی۔ ادبی

> لوگوں سے متعارف ہوا۔ مظفر آباد میں "کشمیر لٹریری سرکل" نامی ادبی تنظیم سرگرم عمل تھی۔ میں اس تنظیم کا حصہ بنا جس کی وجہ سے مجھے ملازمت کے ساتھ ساتھ نت نئی ادبی شخصیات کے ساتھ مل بیٹھنے کا موقع ملا۔"(۱۲)

مظفر آباد میں احمد حسین مجاہد نے آٹھ (۸) سال گزارے اور اُن کا تبادلہ ۲۰۰۶ء میں ایک مرتبہ پھر ایبٹ آباد میں ہوا اور تاحال وہیں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ وہ اس وقت زرعی ترقیاتی بینک منڈیاں ایبٹ آباد میں Incharge Legal Litigation کے عہدے پر فائز ہیں۔ "ادبستانِ ہزارہ" میں پروفیسر ایوب صابرؔ، احمد حسین مجاہد کی پیشہ وارانہ زندگی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> "آج کل زرعی ترقیاتی بینک ایبٹ آباد میں ایم سی او کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔"(۱۳)

پروفیسر بشیر احمد سوزؔ ان کی ملازمت کے متعلق یوں لکھتے ہیں:

> "آپ زرعی ترقیاتی بینک میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔"(۱۴)

انسان کی بنیادی ضروریات میں ذریعۂ معاش پہلی اور بنیادی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احمد حسین مجاہد نے ذریعۂ معاش کو اپنی ضرورت سمجھا اور ملازمت کو اپنا فرض سمجھتے ہوئے اسے بطریقِ احسن نبھایا۔ مگر شاعری کی وجہ سے ہی ان کی پہچان ہوئی ہے۔ انھوں نے ملازمت بھی کی ہے اور شاعری بھی۔ مگر احمد حسین مجاہد اپنی شناخت شاعری کے ذریعے ہی کراتے ہیں جب کہ ملازمت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

۱.۶ ازدواجی زندگی

احمد حسین مجاہد ۲ اپریل ۱۹۹۳ء میں رشتۂ ازدواج سے منسلک ہوئے۔اُن کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔اس حوالے سے احمد حسین مجاہد نے انٹرویو کے دوران راقم کو بتایا:

"ملازمت کے کچھ عرصے بعد والدین نے اپنے ہی خاندان میں
شادی کرائی۔ جس سے مجھے دو بیٹے اور ایک بیٹی جیسی نیک اولاد
نصیب ہوئی۔ بڑے بیٹے کا نام میت شناس خان اور چھوٹے بیٹے کا مشیت شناس خان
نام مخضر احمد خان جب کہ بیٹی کا نام طینت غنا خان ہے۔"(۱۵)

احمد حسین مجاہد کے گھر کا ماحول بہت دوستانہ تھا۔ افرادِ خانہ بشمول چچازاد اور ماموں زاد کزنز کے ساتھ رات گئے تک خوش گپیوں میں مصروف رہتے۔ سردیوں کی لمبی اور ٹھنڈی راتوں میں آگ سینکی جاتی۔ رفیقِ حیات اور اولاد سمیت محفل کی رونق بنے رہتے۔ایک انٹرویو کے دوران احمد حسین مجاہد کی رفیقِ حیات نے کہا:

" احمد حسین مجاہد متحمل مزاج، طبیعت میں شائستگی اور ایک فعال
شخصیت کے مالک ہیں۔ میانہ روی اور محبت ان کا فطری اثاثہ ہے۔
یہ محبت اولاد اور خاندان میں یکساں پھیلاتے ہیں۔"(۱۶)

احمد حسین مجاہد کی ازدواجی زندگی بڑی خوش گوار اور پُر سکون ہے۔ رفیقِ حیات کی آمد سے اُن کے شب و روز حسنِ ترتیب پانے لگے۔ گھر کے معاملات اور رشتہ داروں کے ساتھ تعلقات کو بہتر طریقے سے چلانا ان کا خاصا ہے۔ اپنی رفیقۂ حیات کے متعلق احمد حسین مجاہد نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

"میری شادی اپنے خاندان میں ۲اپریل ۱۹۹۳ ء میں ہوئی۔ میری
زوجہ عالیہ احمد نے میری زندگی کو بنانے سنوارنے میں نمایاں

کردار دا کیا۔ عالیہ احمد وفا شعار، مہمان نواز اور باشعور ہیں۔ وہ
میرے دوستوں کے مقام و مرتبے سے آگاہ ہے اس لیے اس
ضمن میں مجھے کوئی الجھن نہیں ہوتی۔ مہمان نوازی کا ہنر انھیں
وراثت میں ملا ہے۔ کسی کو دکھی دیکھتی ہے تو جو اس کے بس میں ہو
کر گزرتی ہے۔"(۱۷)

احمد حسین مجاہد اولاد اور خاندان کے معاملے میں اپنے آپ کو فعال اور ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ اولاد کی تعلیم و تربیت اور گھریلو معاملات و لین دین کو سلجھانے میں ان کا اہم کردار ہے جس کی وجہ سے گھر کا ماحول علمی ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی بھی ہے۔

۱.۷ ادبی فتوحات

انسان اور ماحول دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ایک اچھا اور خوش گوار ماحول انسان کو اُفق پر اس طرح پہنچا دیتا ہے جیسے اجالے میں کرنوں کا نمودار ہونا۔ یہی وجہ ہے کہ احمد حسین مجاہد کو خوش گوار ادبی ماحول ورثے میں ملا اور احمد حسین سے احمد حسین مجاہد بن کر صفحۂ ہستی پر نمودار ہوئے۔ ان کی ادبی فتح کا آغاز زمانۂ طالبِ علمی میں ہی ہو چکا تھا۔ رفتہ رفتہ ادبی ماحول اور شعری ذوق ان کی حیات میں حائل ہوتا چلا گیا۔ زرعی یونیورسٹی پشاور میں انھیں اُردو ادب کی عظیم اور معروف شخصیات کی نہ صرف صحبت میسر آئی بلکہ ان کی حوصلہ افزائی بھی ہوئی۔ شعبۂ اُردو پشاور یونیورسٹی کے معزز اور قابل احترام شعرا ڈاکٹر نذیر تبسمؔ اور خاطرؔ غزنوی نے مزید ان کی رہنمائی کی اور پہلا مشاعرہ پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ اپنی فتح کے آغاز کے متعلق احمد حسین مجاہد یوں گویا ہیں:

"پشاور میں دورانِ تعلیم بہت سے ادبی لوگوں کی صحبت میسر آئی۔
پشاور یونیورسٹی شعبۂ اُردو میں ڈاکٹر نذیر تبسم اور خاطر غزنوی جب
کہ اسلامیہ کالج پشاور میں محسن احسان اور اشرف بخاری سے

تعارف ہوا۔ اسی دوران ۱۹۷۸ء میں، میں نے خاطر غزنوی اور ڈاکٹر نذیر تبسم کی سرپرستی میں اپنی زندگی کا پہلا مشاعرہ پڑھا۔"(۱۸)

زرعی ترقیاتی بینک ایبٹ آباد میں بطور ڈپٹی ڈائریکٹر تعینات ہوئے۔ اس دوران اُن کی بہت سے علمی و ادبی حلقوں سے وابستگی رہی۔ ایبٹ آباد میں ایک ادبی تنظیم "بزمِ اہلِ قلم" کا پلیٹ فارم میسر آیا۔ اس ادبی تنظیم کے صدر حفیظ اثرؔ اور جنرل سیکرٹری نیاز سواتیؔ مرحوم تھے۔(نیاز سواتی ایبٹ آباد بورڈ کے چیئرمین اور پوسٹ گریجویٹ کالج ایبٹ آباد کے پرنسپل بھی رہ چکے ہیں۔)"بزمِ اہلِ قلم" نے ان کی شاعری کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ اس حلقے کے ذریعے ان کی نظم نگاری اور غزل گوئی کو ایک نیا اور منفرد مقام عطا ہوا۔ اس دوران انھوں نے اپنے آبائی شہر بالاکوٹ میں بھی ایک ادبی تنظیم کی بنیاد رکھی جس کا مقصد نئے لکھنے والوں کے لیے راہیں ہموار کرنا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کی کتب کی رونمائی کرنا تھا۔ اس تنظیم کے متعلق احمد حسین مجاہد نے بتایا:

"میں ایبٹ آباد بینک میں ملازم تھا۔ اس دوران مجھے وہاں ایک تنظیم میسر آئی۔ مگر میں نے اپنا ادبی سفر محدود نہیں رکھا بلکہ اس کے متبادل بالاکوٹ میں ایک ادبی تنظیم "الفاظ" کی بنیاد رکھی، جہاں مشاعرے ہوتے، نئے لکھنے والے متعارف ہوتے اور کتب کی رونمائی ہوتی"۔"(۱۹)

ادبی تنظیم "الفاظ" میں ہزارہ کے شعرا کافی تعداد میں شامل ہوتے۔ اس کے علاوہ راولپنڈی کے طارق نعیم اور اختر عثمان بھی اس تنظیم کا حصہ رہے۔ ۲۰۰۵ء کے زلزلہ میں یہ تنظیم غیر فعال ہو گئی۔

۱۹۹۸ء میں اُن کا تبادلہ مظفر آباد میں ہوا۔ اس دوران مظفر آباد کی ایک مشہور ادبی تنظیم "کشمیر لٹریری سرکل" کا حصہ بنے۔ اس تنظیم کے جنرل سیکرٹری اعجاز نعمانی تھے۔ اس تنظیم کے اراکین میں افتخار مغل، صابر آفاقی، مخلص وجدانی، توصیف خواجہ، احمد عطاء اللہ، ابراہیم گل، آمنہ بہار اور فرزانہ فرخ شامل تھے۔ اس تنظیم اور ان کے اراکین کے متعلق احمد حسین مجاہد کہتے ہیں:

> "مظفر آباد کی ادبی تنظیم "کشمیر لٹریری سوسائٹی" نے مجھے نہ صرف خوش آمدید کہا بلکہ اس ادبی سوسائٹی نے مجھے "صدر" کے عہدے پر فائز کر دیا۔ اس تنظیم کے اب دو عہدے ہو گئے تھے ایک جنرل سیکرٹری جب کہ دوسرا صدر کا۔"(۲۰)

مظفر آباد میں آٹھ سال گزارنے کے بعد ان کا تبادلہ پھر ایبٹ آباد ہوا اور یہاں کی نمائندہ تنظیم "بزم علم و فن" کے سینئر نائب صدر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس کے علاوہ ہزارہ کی ایک اور مشہور و معروف تنظیم "حلقۂ یاراں شنکیاری" کی سرگرمیوں میں بھی شامل عمل رہے۔ اس تنظیم کے دوران رستم نامیؔ، میجر امان اللہ خان امانؔ، محمد حنیفؔ، سید عبد اللہ شاہ مظہرؔ (مرحوم)، تاج الدین تاج اور دیگر شعرا سے تعارف ہوا اور ان کی شاعری کو سراہا گیا۔

احمد حسین مجاہد کا شمار اکادمی ادبیات اسلام آباد کے وظائف کمیٹی کے اراکین میں ہوتا ہے۔ ان کی تصنیف "رموزِ شعر" بھی اسی ادارے کے تحت شائع ہوئی۔ ۲۰۱۱ء میں آصف ثاقب کے ساتھ مل کر ان کا شعری انتخاب بھی اسی اکادمی سے شائع کیا۔ علاوہ ازیں ۲۰۱۲ء میں ایک ادبی روزنامہ "صبح" کے ادبی ایڈیشن (ایک صفحہ) کا اجرا بھی کیا۔ ان کی ابتدائی غزلیات "روزنامہ نوائے وقت" اور "روزنامہ جنگ" کے ادبی صفحات میں شائع ہوتی رہیں۔ حفیظ اثرؔ کی زیرِ صدارت شائع ہونے والے ماہنامہ "نو بہار" میں بھی اُن کا کلام چھپتا رہا۔

احمد حسین مجاہد کا اُردو کلام اُردو ادبی دنیا کے بڑے رسائل و جرائد میں شامل ہوتا رہا۔ جن میں "فنون"، "اوراق"، "سیپ"، "تسطیر"، "جدید ادب جرمنی"، "تجدیدِ نو"، "ارتکاز"، "معاصر"، "لوح"، "عکاس"، "اُردو ادب جرمنی"، "اسباق (انڈیا)"، "شعر و سخن" وغیرہ شامل ہیں۔ بحیثیتِ نقاد وہ زیادہ تر ادبی اصناف (جن میں افسانہ، ناول، سفرنامہ، غزل اور نظم وغیرہ شامل ہیں) پر تنقیدی مضامین بھی لکھتے ہیں۔ یہ مضامین وقتاً فوقتاً رسائل و جرائد کی زینت بنتے رہتے ہیں۔

۱.۸ سیرت و شخصیت

کسی بھی ادیب، مصنف یا شاعر کی سیرت و شخصیت ادب پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ اس لیے یہ لازمی اور بنیادی امر ہے کہ کسی بھی فن کار کے فن پاروں کا فکری و فنی مطالعہ کرنے سے قبل اس کی شخصیت کا مطالعہ ضروری ہے۔ سیرت و شخصیت کے حوالے سے احمد حسین مجاہد نمایاں خصوصیات رکھتے ہیں۔ وہ انتہائی مشفق، نرم خُو اور محبت سے پیش آنے والی شخصیت ہیں۔ ان کا ظاہر و باطن دونوں یکساں طور پر خوب صورت ہیں۔ ان کا مزاج دھیما ہے۔ ان کی مسکراہٹ دلآویز ہے اور سادہ طبیعت کے دل آویز انسان ہیں۔ احمد حسین مجاہد انا پسند اور نرگسیت شخصیت کا نام ہے۔ ایک انٹرویو کے دوران ان کے دوست محمد حنیفؔ نے کہا:

> "انا پرستی اور نرگسیت تو انسان میں ہوتی ہے۔ مجاہدؔ دوستوں کو
> پروموٹ کرنے والے ہیں۔ ان کی نرگسیت بیمار نہیں ہے۔ ہم
> اسے انا پرست نہیں انا پسند کہہ سکتے ہیں۔" (۲۱)

نیک دِلی اور ہمدردی احمد حسین مجاہد کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ہے۔ بے سہاروں کا سہارا بنتے ہیں، غریبوں کی حمایت کرتے ہیں، نئے لکھنے والوں کو حوصلہ دیتے ہیں اور ان کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ گھنے پیڑ کی مانند ہمیشہ چھاؤں دینے کے متمنی ہوتے ہیں۔ ان کے دوست احمد عطاء اللہ نے

راقم کو بتایا:

> "میرے نزدیک ان کی شخصیت اور علمی شخصیت دونوں انکسار کی اس سطح پر ہیں جہاں انسان نباتات یعنی گھنے پیڑ کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ احمد حسین مجاہد وہ گھنا پیڑ ہے جس کی چھاؤں میں عام لوگ، نئے لکھنے والے اور قارئین سکون محسوس کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں انسان دوستی اور شفقت اس بھرپور طریقے سے موجود ہے کہ دونوں یعنی لکھنے والے اور عام قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔"(۲۲)

احمد حسین مجاہد کی شخصیت خوشبوؤں، پھولوں اور دھنک کے حسین رنگوں کا ایک مرقع ہے۔ اُن کے خدوخال سے اس قوس قزح کا حسن نمایاں ہوتا ہے جو بارش کے بعد آسمان پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ وہ خود بھی جمالیاتی تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اپنی شخصیت میں نکھار پیدا کرنے کے ہنر سے بیگانہ نہیں۔ ان کی شاعری میں بھی اپنی دل پذیر رونمائی کا سبب بنتے ہیں۔ احمد حسین مجاہد ہزارہ کی ادبی فضا میں اپنی منفرد خوشبو کو متعارف کرواتے ہوئے ایسے پھول بن جاتے ہیں جس کے رنگ اور کلیاں دل کو موہ لیتی ہیں۔

احمد حسین مجاہد کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کا قدرتی مناظر سے لگاؤ اور دل چسپی ہے۔ ان کا آبائی شہر بالاکوٹ جو پہاڑوں کے وسط میں پھیلا ہوا ہے، بل کھاتا دریائے کنہار اور سرسبز وشاداب وادیاں، بہتی آبشاریں، گھنے جنگل، ہرے بھرے لہلہاتے کھیت اور قد آور چیڑھ کے درخت اس شہر کا حصہ ہیں۔ اُن کی شخصیت اور شاعری ان تمام قدرتی مناظر سے بھرپور نظر آتی ہے۔ وہ ان قدرتی مناظر سے گہری دل چسپی رکھتے ہیں۔ مظفر آباد ملازمت کے سلسلے میں انھوں نے وہاں کے ماحول کو بھی قبول کیا اور اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ فطری لگاؤ اور شاعری کے حوالے سے احمد حسین مجاہد یوں

گویا ہیں:

"جتنا شعر و ادب سے تعلق ہے اتنا ہی مجھے ان قدرتی مناظر سے
بھی دل چسپی ہے۔ مظفر آباد دورانِ ملازمت فارغ وقت میں
جنگلات میں سیر و سیاحت کی۔ بالاکوٹ تو میرا شہر ہے، وہاں پر ہر
جگہ سے خوب آشنا ہوں۔ ناران اور کاغان قیام بھی کیا۔ سیر و
سیاحت اور قدرتی مناظر میری زندگی کا آئینہ دار ہیں۔"(۲۳)

احمد حسین مجاہد، غالبؔ، ناصرؔ، احمد ندیمؔ قاسمی اور فرازؔ کی شاعری کو بہت پسند کرتے ہیں۔ شاعرہ میں پروین شاکرؔ کی شاعری کو پسند کرتے ہیں۔ شعر اسے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تصنیف "دھند میں لپٹا جنگل" میں چند شخصیات کے نام اپنا کلام نذر کیا ہے جن میں پروین شاکر، مرزا اسد اللہ خان غالبؔ اور احمد فرازؔ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ پروین شاکر کے نام ایک نظم لکھی ہے جس میں نہ صرف ان کی شخصیت کا عکس دکھایا ہے بلکہ ساتھ ساتھ اس نظم میں ان کے مجموعوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ "پروین شاکر کے لیے ایک نظم" سے چند مصرعے درج ذیل ہیں:

قضا تازہ غزل میں
اک اچھوتے لفظ ہی کو
قافیہ کرنے کی درپے تھی
اک ایسا لفظ جس میں
شدتِ اظہار کے سارے قرینے ہوں
جیسے "خوشبو" نے اپنی
"خود کلامی" میں شریک راز رکھا ہو (۲۴)

"دھند میں لپٹا جنگل" میں احمد حسین مجاہد نے مرزا اسد اللہ خان غالب کے مقام و مرتبے کو بیان کیا ہے اور انھیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ اس حوالے سے نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

حصولِ منصب و رتبہ نہ تھا شعار اس کا
قلندروں کا سلیقہ تھا افتخار اس کا
جو بادشاہ تھے اس شخص کے غلام ہوئے
مقام اس کی تمنا میں بےمقام ہوئے (۲۵)

احمد حسین مجاہد نے اپنے اس پہلے مجموعۂ کلام میں احمد فرازؔ کے نام ایک غزل لکھی ہے۔ غزل کے چند اشعار یہ ہیں:

صدف میں گہر تو کہیں دیکھنا
جو ہم دیکھتے ہیں نہیں دیکھنا
اس انجان رستے میں کوئی اگر
بلائے تو مڑ کر نہیں دیکھنا (۲۶)

"اوک میں آگ" احمد حسین مجاہد کی شخصیت بالکل واضح نظر آتی ہے۔ مطالعہ کرتے ہوئے قارئین یہ محسوس کرتے ہیں کہ "اوک میں آگ" دراصل ان کی شخصیت ہی ہے۔ والدین کی محبت اور پھر عالمی سطح پر انسانیت کا احترام ان کی شخصیت کا نمایاں اور بنیادی وصف ہے۔ اس مجموعۂ کلام میں ایک نظم "مرے بابا نہیں ہیں ناں" اس انداز سے پیش کی ہے کہ جسے پڑھ کر ہر کوئی اپنی داستان سمجھتا ہے۔ "مرے بابا نہیں ہیں ناں" سے چند اشعار درج ذیل ہیں:

مرے بابا نہیں ہیں ناں!
میں تپتی دوپہر میں
شہر کی سڑکوں پہ اپنے جسم کا ایندھن جلاتا ہوں
تو گھر میں چولہا جلتا ہے
مرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں (۲۷)

احمد حسین مجاہد دراصل احساسات کے شاعر ہیں۔ معاشرے میں رونما ہونے والے سماجی استحصال، ظلم و جبر اور بے کس و ناتواں طبقے کی آہ و فغاں ان کے کلام کا حصہ ہے۔ ایک نظم "ماں کہانی سناتی نہیں" کا عنوان ہی دل سوز اور کرب و ملال سے بھرا ہے۔ جس میں اس بات کی عکاسی کی گئی ہے کہ انسان اپنے پیٹ پوجا کی خاطر گھر سے بے گھر ہو کر دَر دَر کی خاک چھانتا پھرتا ہے جس کی بدولت انسان اپنی تہذیب اور رسم و رواج بھول چکا ہے اور یہاں تک کہ ماں کی ممتا بھی نصیب نہیں ہوتی۔

احمد حسین مجاہد نے سانحہ آٹھ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ہر طرف لاشوں کے انبار تھے۔ قیامت سی برپا تھی۔ ماں کا پیار گیا تو باپ کا سایہ گیا، بھائی کا سہارا گیا تو بہن کی مسکراہٹ گئی۔ ۲۰۰۵ء کے اس زلزلے نے بالاکوٹ شہر کو مکمل طور پر اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بغیر کفن دفن کے بے سر و سامان لاشوں کو سپردِ خاک کیا گیا۔ جس کی تصویر کشی احمد حسین مجاہد نے "آٹھ اکتوبر ۲۰۰۵ء" میں یوں کی ہے:

پانی تھا میسر، نہ کفن تھا، نہ دعائیں
بے طَور ہر اک پیر وجواں دفن کیا تھا
ملبے سے نکالے تھے کئی پھول کئی خواب
اب یاد نہیں کس کو کہاں دفن کیا تھا (۲۸)

احمد حسین مجاہد اپنی سیرت و شخصیت سے مکمل اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کے ہاں نشاط اور امید کا رنگ نمایاں ہے۔ ان کے نزدیک عشق و محبت ہی وہ واحد مرکز ہے جس کے گرد کائنات گھومتی ہے۔ مخلوقِ خدا میں محبتیں تقسیم کرتے ہیں اور اپنی شاعری میں لفظ "محبت" اور "امن" کے ذریعے یہ پیغام دیتے ہیں کہ عشق و محبت ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے انسان دنیا کو فتح کر سکتا ہے، اپنے مستقبل کو روشن کر سکتا ہے۔

1.9 تصانیف و تالیفات

احمد حسین مجاہد کو اگر شاعر ہی کہا جائے تو یہ گوارا نہ ہو گا بلکہ آپ بہترین غزل گو، نظم نگار، نثر نگار اور نقاد بھی ہیں۔ اُردو شاعری کے دو مجموعے منظرِ عام پر آئے مگر آپ ہندکو شاعری میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ نثری اصناف پر گاہے گاہے اصلاحی تنقیدی مضامین بھی لکھتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کی تخلیقات و تالیفات ذیل میں ترتیب وار پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ دھند میں لپٹا جنگل

(اُردو غزلیات اور نظم نگاری پر مشتمل شعری مجموعہ) ۱۹۹۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔

۲۔ سیف الملوک

ایک نثری داستان ہے جو ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی۔

۳۔ صفحہ خاک

آٹھ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے زلزلے کے متعلق ہے جو ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی۔

۴۔ اوک میں آگ

اُردو غزلیات اور نظموں کا مجموعہ جس کی اشاعت ۲۰۱۴ء میں ہوئی۔

۵۔ قینچی

ہزارہ کی ہندکو لوک داستان ۲۰۱۶ء میں شائع ہوئی۔

۶۔ رموزِ شعر

نئے لکھاریوں کے لیے رہنما کتاب، ۲۰۱۷ء میں پبلش کی گئی۔

۷۔ ٹھنڈے خواب دی چھائی

یہ ہندکو شاعری کا مجموعہ ہے، سنِ اشاعت ۲۰۱۸ء ہے۔

مندرجہ بالا تصانیف کے علاوہ احمد حسین مجاہد نے تالیف و انتخاب میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے، جس میں "نیرنگ خیال" کا ماہیا نمبر، معذوروں پہ لکھی گئی شاعری "خاک پہ رکھے خواب" اور اکادمی ادبیات پاکستان کے لیے "۲۰۱۱ء کی شاعری کا انتخاب" شامل ہیں۔ احمد حسین مجاہد کی تخلیقات و تالیفات کا اعتراف ڈاکٹر نذیر تبسم کچھ یوں کرتے ہیں:

> "صوبہ سرحد (ہزارہ کے پی کے) کے انتہائی دور دراز لیکن انتہائی خوب صورت ترین علاقے وادیٔ کاغان سے تعلق رکھنے والا یہ صاحبِ مطالعہ شاعر ڈگری یافتہ بھی ہے اور مسلسل ریاضت نے اسے حرفوں کا نبض شناس بنا دیا ہے۔" (۲۹)

۱.۱۰ ایوارڈز / امتیازات

احمد حسین مجاہد نے اپنی زندگی میں تخلیقات کا سلسلہ جس طرح لامحدود رکھا ہے اسی طرح زمانے نے ان کی خدمات کو سراہا اور انھیں بہت سے اعزازات و امتیازات سے نوازا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سید سلیمان نے ایک اخبار "اُردو لنک یو ایس اے" میں ان کے اعزازات کی ترتیب کچھ یوں کی ہے:

> یونین آف جرنلس بالاکوٹ، تحصیل بار بالاکوٹ اور ڈیسنٹ کلب بالاکوٹ نے احمد حسین مجاہد کو "پرل آف دی سائل" کا خطاب دیا۔ عمائدینِ بالاکوٹ نے ایک تقریب میں احمد حسین مجاہد کو بالاکوٹ کی روایتی پگڑی پہنائی اور "فرزندِ بالاکوٹ" کا لقب دیا۔ کشمیر لٹریری فورم، مظفر آباد نے آپ کی ادبی خدمات کے صلے میں

> آپ کو مظفر آباد شہر کی چابی پیش کی۔پاکستان ٹیلنٹ کونسل نے ۲۰۰۰ء میں آپ کو"بہترین شاعر" کی شیلڈ پیش کی۔ سدا بہار آرٹس کونسل نے ۲۰۱۸ء میں آپ کو"بہترین شاعر" قرار دیا۔
> احمد حسین مجاہد کے شعری مجموعہ "اوک میں آگ" کو ننکانہ صاحب(پنجاب)کی ادبی تنظیم "وجدان" نے ۲۰۱۴ء میں باباجی گرونانک ایوارڈ سے نوازا۔اکادمی ادبیات پاکستان نے آپ کو ہندکو شاعری کی کتاب" قینچی"کو سال ۲۰۱۶ء کی بہترین کتاب قرار دیتے ہوئے اسے سائیں احمد علی ایوارڈ سے نوازا "۔"(۳۰)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ احمد حسین مجاہد ایک عظیم شاعر ہیں۔ان کی شاعرانہ عظمت کی وجہ سے مختلف اداروں نے مختلف اعزازات و القابات سے نوازا ہے۔ یہ نوازشات ان کے لیے حوصلہ مند اور قابلِ عزت ہیں جس کی بدولت وہ شاعری کی گہرائی و گیرائی اور وسعتوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ بحیثیتِ شاعر اُن کی شاعری کسی انعام و اکرام کی طلب گار نہیں بلکہ یہ اعزازات اُن کی حوصلہ افزائی اور عزت و احترام کے لیے مدو معاون ہیں۔

۱.۱۱ تصانیف کا تعارف

احمد حسین مجاہد صرف شاعر ہی نہیں بلکہ بہترین محقق اور نقاد بھی ہیں۔زمانۂ طالبِ علمی سے لے کر تاحال انھوں نے مختلف اصناف پہ قلم اُٹھایا لیکن ان کی پہچان شاعری سے ہوتی ہے نا کہ تحقیق و تنقید سے۔ اُن کی شاعری پر مختلف نقادوں نے مختلف آرا کا اظہار کیا ہے۔اس حوالے سے آصف ثاقب "جدید ادب جرمنی" میں رقم طراز ہیں:

> " احمد حسین مجاہد کی شاعری بادِ شمال کی چبھتی ہوئی تربیتوں سے جوان ہونے والے کے دکھوں کا ثمرہ ہے۔ جھولتی شاخ کے پتوں

کی گنگناہٹوں سے مزّین غزل، دردِ نظارہ کی سرخیوں سے خوش بدنی
لے کر آموجود ہونے والی نظم، اس کی شدت احساس کی ہم نوا
ہوتی دیکھی جاتی ہے۔ مجاہد تغزل کے آثار جمع کرنے میں کامیاب
ہے۔اس کی شاعری ہاڑ کی سخت گرمی میں اُڈی ہوئی بدلی ہے جو
برس پڑے گی تو حدتِ وجود کو تھپیڑے بھی لگائے گی اور بوسے
بھی دے گی۔"(۳۱)

احمد حسین مجاہد کے ہاں فطرت سے گہری دل چسپی اور محبت وافر ہے۔ یہ دونوں جذبے ان کی شاعری کے بنیادی عناصر ہیں جن کے تحت وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں۔اس طرح ان کے اب تک اُردو کے دو مجموعے سامنے آچکے ہیں جن کا مختصر تعارف ذیل میں پیش کیا جارہا ہے:

دھند میں لپٹا جنگل

احمد حسین مجاہد کی تصانیف میں سب سے پہلا باقاعدہ شعری مجموعہ "دھند میں لپٹا جنگل" ۱۹۹۷ء میں عکاس پبلی کیشنز اسلام آباد سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کے کل ایک سو ساٹھ صفحات ہیں۔ مجموعے کے پس ورق پر ابتدا میں دھند میں لپٹا جنگل ہے جہاں درخت کی شاخ پہ ایک پرندہ گم صُم خاموش بیٹھا ہے۔ دوسری طرف پس ورق پر اُردو کے معروف شاعر افتخار عارف کا مختصر مگر جامع تذکرہ موجود ہے۔ افتخار عارف پس ورق پر اپنے تاثرات ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

" احمد حسین مجاہد کا شعری سرمایہ "دھند میں لپٹا جنگل"میرے
لیے ایک خوش گوار حیرت کا سبب بنا۔ آغازِ شعر میں اس سج دھج
کی غزل اور بنت کی ایسی پکی نظم لکھنا ہر ایک کے بس کی بات
نہیں۔پہلے مجموعے میں اکثر پاس اور دور کی آوازیں سنائی دیتی ہیں
اور پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں مگر احمد کے مطلع سے لے کر
الوداعیہ نظم کے آخری مصرعے تک ایک تازہ کار اور تازہ نفس

تخلیق کار کی آمد آمد کی گونج سنائی دیتی ہے۔"(۳۲)

احمد حسین مجاہد نے اس مجموعے کا انتساب والدِ محترم "غلام حسین بیکسؔ۔ مرحوم و مغفور" کے نام کیا ہے جن کی ذات کے مکتب کو وہ اپنے لیے احترامِ انسانیت اور تفہیمِ اسرار کائنات کا قرینہ سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ احمد حسین مجاہد نے "حرفِ تشکر" میں اپنے ہمدم دیرینہ سفیر احمد لغمانی کا نام شامل کیا، جس کے بارے میں انھوں نے لکھا:

"ہمدم دیرینہ سفیر احمد لغمانی جس نے اپنی رفاقتوں کی مہک سے
میرے مشامِ جاں کو سبھی رتوں میں معطر رکھا۔"(۳۳)

والدِ محترم اور دوست سفیر احمد لغمانی کے بعد مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کی غزل کا ایک مصرع درج ہے ۔اس مجموعے میں کل سنتالیس (۴۷)غزلیات ہیں جب کہ تیس(۳۰) نظمیں مختلف عنوانات سے لکھی گئی ہیں۔ احمد حسین مجاہد غزل اور نظم دونوں پہ گرفت رکھتے ہیں۔ "دھند میں لپٹا جنگل" صنفِ شاعری کے لحاظ سے مکمل ہے، جس کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی "فنون" میں یوں رقم طراز ہیں:

"دھند میں لپٹا جنگل" ان کی غزلوں اور نظموں کا خوب صورت مجموعہ ہے۔ اس کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ ان شعری تخلیقات کے عقب میں ایک جیتا جاگتا باشعور ذہن، ایک نہایت درجہ حساس دل اور امکانات سے چھلکتا ہوا ایک وجدان کارفرما ہے۔ مجاہد کا یہ پہلا مجموعہ کلام ہے مگر یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ان کا بھرپور مستقبل پوری آن بان سے جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ شاعری کی دونوں اصناف غزل اور نظم پر استادانہ حد تک حاوی ہیں۔"(۳۴)

"دھند میں لپٹا جنگل"کی آمد پر اسے علمی و ادبی حلقوں میں خوش آمدید کہا گیا۔ مختلف

رسائل و جرائد میں اس کلام کا چھاپا گیا اور نقادوں نے اس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس مجموعۂ کلام کے بارے میں پروفیسر نذیر تبسمؔ "سرحد کے اُردو غزل گو شعرا" میں تاثرات پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"احمد کی جس شعری خاصیت کی طرف لازماً اشارہ کرنا ہے وہ اس کی غزلوں کی منفرد خوب صورت اور دل آویز زمینیں ہیں، خصوصاً اس نے جیسی ردائف انتخاب کی ہیں اور جس ہنرمندی سے ان کو نبھایا ہے وہ اس کی فنی دسترس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس سارے بیانیہ میں اس کے تخلیقی جوہر بڑے کھل کر سامنے آئے ہیں اور اس نے ایک اعتبار سے حبس زدہ رتوں میں بادِ صبا کی سی ذمے داری نبھائی ہے۔"(۳۵)

مجموعے کے آغاز میں احمد حسین مجاہد نے غالبؔ کی غزل سے ایک مصرع کا انتخاب کیا ہے:

"دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا" (۳۶)

غالبؔ کے اس مصرعے کے بعد احمد حسین مجاہد کے مجموعے کی فہرست عجیب مگر انوکھی ہے۔ پہلے تین نظمیں، پھر سات غزلیات، چار نظمیں، سات غزلیات، چار نظمیں، سات غزلیات، چار نظمیں، سات غزلیات، پانچ نظمیں، چھے غزلیات، چار نظمیں، سات غزلیات، چار نظمیں، چھے غزلیات اور آخر میں پانچ نظمیں موجود ہیں۔ احمد حسین مجاہد کی اس فہرست کے مرتب کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جیسے انھوں نے فہرست کے اصولوں کو بھی علمِ عروض ہی کی طرح مرتب کر دیا ہو جس میں ایک خاص قسم کی موسیقی اور روانی ہو۔ فہرست کے بعد ہزارہ کے نامور اور مشہور شاعر آصف ثاقبؔ نے مجموعی طور پر اس مجموعے کے متعلق اپنی آرا کچھ یوں درج کی ہیں:

" احمد حسین مجاہد کی شاعری بادِ شمال کی چھبتی ہوئی تربیتوں سے جوان ہونے والے کے دکھوں کا ثمرہ ہے۔ جھولتی شاخ کے پتوں

کی گنگناہٹوں سے مزّین غزل، دردِ نظارہ کی سرخیوں سے خوش بدنی
لے کر آموجود ہونے والی نظم، اس کی شدت احساس کی ہم نوا
ہوتی دیکھی جاتی ہے۔"(۳۷)

آصف ثاقب "مجاہد کی شاعری، جنگل میں ایک راستہ" کے بعد احمد حسین مجاہد کی حمدیہ نظم ہے جو عقیدت سے بھرپور ہے۔ اس نظم میں وہ ذاتِ باری تعالیٰ اور اس کی کائنات میں موجود ہر اک شے کے قائل دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے:

خیال و خواب کی حد سے ہے ماورا اللہ
مری نظر میں ہمیشہ مگر رہا اللہ
مرے لبوں کو معطر ہواؤں نے چوما
ہر اک شے نے مرے ساتھ جب کہا اللہ (۳۸)

احمد حسین مجاہد کا پہلا مجموعۂ کلام "دھند میں لپٹا جنگل "فکری و فنی خصائص سے بھرپور ہے۔ ان کی نظم نگاری اور غزل گوئی ایک جیتے جاگتے معاشرے کی عکاس ہے۔ سماج میں ہونے والی ناہمواریوں اور ظلم و جبر کو جس نگاہ سے دیکھا اسے بعینہ بیان کیا۔ اس لیے یہ مجموعۂ کلام نہ صرف احمد حسین مجاہد کی شاعری کا محور ہے بلکہ ساتھ ساتھ اُردو ادب میں ایک معتبر حوالہ بھی ہے۔

اوک میں آگ

احمد حسین مجاہد کا دوسرا مجموعۂ کلام "اوک میں آگ" ہے۔ یہ مجموعہ پہلے مجموعے کے تقریباً سترہ سال بعد ۲۰۱۴ء میں سانجھ پبلی کیشنز نے حفیظ پرنٹرز کی زیرِ صدارت لاہور سے شائع کیا۔ اگرچہ یہ مجموعہ تاخیر سے منظرِ عام پر آیا مگر پہلے مجموعے سے زیادہ اپنے اندر معنویت و گہرائی سموئے ہوئے ہے۔ اس مجموعے کے کل ایک سو بیس (۱۲۰) صفحات ہیں اور انتساب اپنی رفیقۂ حیات "عالیہ احمد" کے نام کیا ہے۔

"اوک میں آگ" کے پس ورق پر دائیں جانب ایک تصویر ہے جو اوک میں آگ کی آئینہ دار ہے۔ بائیں طرف معروف و مشہور شاعر محمد اظہار الحق نے بھرپور تاثرات میں اس تصنیف کے بارے میں جامع الفاظ کی رائے کا اظہار کیا ہے:

"اس کے اشعار مجموعی طور پر، نگارِ غزل کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں! اس کی شاعری کے اجزائے ترکیبی ہی ایسے ہیں۔ نرمی میں گُندھی ہوئی خوب صورت لفظیات، لفظوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے والی ایسی بُنت جو کہکشاں کی طرح ستاروں کو باہم مربوط کر دے، لہجہ جس میں نقرئی کھنک ہے، تغزل جو مضامین اور الفاظ دونوں سے اتنا ہم آہنگ ہے کہ ہر حال میں بلند معیار برقرار رکھتا ہے اور پھر ان سب صفات کو وہ مجموعی تاثر ہے جو مجاہد کو سخن کے میدان میں قابلِ رشک اعتبار بخشتا ہے۔"(۳۹)

"اوک میں آگ" کے ابتدا میں احمد حسین مجاہد کا ایک قطعہ شامل ہے۔ اس قطعہ میں بارگاہِ الٰہی سے متوجہ ہو کر التجائیہ انداز اپنائے ہوئے ہیں۔ قطعہ ملاحظہ کیجیے:

جھونکے ہوا کے مجھ سے مہک مانگتے پھریں
ایسا کوئی شگوفہ سرِ شاخسانہ دے
بھر دے مرا وجود محبت کے نُور سے
مجھ کو زمیں کا عجز، فلک کا وقار دے (۴۰)

اس نظم میں کل نظموں اور غزلیات کی تعداد اکہتر (۷۱) ہے۔ نظموں میں رباعیات، قطعات اور آزاد نظموں کو عمدگی اور بہترین اسلوب سے برتا گیا ہے۔ اس کے بعد مجموعے کا دیباچہ شعبۂ اُردو پنجاب یونیورسٹی لاہور کے پروفیسر ناصر عباس نیرؔ نے مختصراً مگر جامع انداز میں خیالات کا

اظہار کیا ہے۔ ناصر عباس نیرؔ "اوک میں آگ" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"احمد حسین مجاہد کی غیر وابستگی انھیں فرد، مقامی سماج، عالمی دنیا،
لمحۂ حال، ماضی، صنفی امتیازات سے متعلق شعر کہنے پر اکساتی ہے۔
دگر گوں سماجی اور عالمی صورتِ حال کا شعری بیان ان کے یہاں
موجود ہے، اور اپنے مخصوص علامتی انداز میں۔ ان اشعار کا لہجہ،
دلِ دردمند کی پکار ہے۔"(۴۱)

مجموعے کا باقاعدہ آغاز احمد حسین مجاہد نے امام العصر علامہ محمد اقبالؔ کی فارسی نظم کا اُردو ترجمہ بطور رباعی کیا ہے، جس میں انھوں نے عشق بے خودی کے جہان کو سمو دیا ہے اور عشقِ نبی ﷺ کی وہ انتہا بیان کی ہے کہ جس سے عشقِ محمد ﷺ والوں کے دل کو تڑپا کر رکھ دیتی ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

تو غنی ہے دوجہاں سے، میں فقیرِ رہگذار
روزِ محشر لاج رکھ لینا مری پروردگار
پھر بھی جو لازم ہو میرے دفترِ عصیاں کی جانچ
مصطفیٰ ﷺ کے سامنے کرنا نہ مجھ کو شرمسار (۴۲)

"اوک میں آگ" کی پہلی نظم "اے میرے خدا!" کے نام سے ایک مناجات ہے، جس میں بارگاہِ پروردگار میں نہایت عجز وانکساری سے یہ التجا کر رہے ہیں:

ہوائے صبح کے چہرے پہ خاک اڑتی ہے
عذابِ دربدری جانے اب کہاں لے جائے
سوادِ دشت تحیر میں کوئی پھول کھلا
ورائے حدِ بیاں! مجھ پہ منکشف ہو جا (۴۳)

احمد حسین مجاہد کے مجموعے کی دوسری اہم نظم نعت ہے۔ اس نعت میں سرکار دوعالم

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے عشق و محبت کا اظہار کیا۔ عقیدت سے بھرپور چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

محفلِ نعت میں آیا ہوں میں اس مان کے ساتھ
مجھ پہ آقاؐ کی نظر ہے بڑے احسان کے ساتھ
نور اترا تو ہوئی نور کی تجسیم بھی خوب
شانِ تفہیم ہے قرآن کی قرآن کے ساتھ
میرا ہر سانس ہو بوصیریؒ کا مصرع احمدؔ
روزِ محشر وہ بلائیں مجھے حسان کے ساتھ (۴۴)

علاوہ ازیں "اوک میں آگ" میں غزلیات کی تعداد زیادہ ہے مگر غزلیات کے مقابلے میں اس مجموعے کی نظمیں پُر اثر اور معنی خیز ہیں۔ جن میں "ٹوٹی چوڑیاں"، "Guilty Love"، "دریا"، "وہ کون تھی"، "مرے بابا نہیں ہیں ناں"، "ماں کہانی سناتی نہیں"، "زندگی بھر کا مسافر" اور "آٹھ اکتوبر ۲۰۰۵ء" جیسی نظمیں شامل ہیں۔ اس حوالے سے افتخار مغل اپنے ایک مضمون "تازہ برف پر پھیلی دھوپ سی شاعری" میں یوں لکھتے ہیں:

> "ان کی شاعری میں تازہ کاری کا اجلا پن اس طرح موجود ہے جس طرح بجلی کی تاروں میں برقی رو ہر جگہ موجود ہوتی ہے لیکن یہ رو ایسی خوش گوار ہے کہ تار کا چھلکا اتار کر محسوس کرنے والے کو نامانوسیت کا جھٹکا نہیں لگتا ایک مانوس سی گدگدی ہوتی ہے جو روح کو شانت کر دیتی ہے۔" (۴۵)

"اوک میں آگ" کی اشاعت پر پہلے مجموعے کی طرح اس کو خوش آمدید کہا۔ ادبی حلقوں میں اس کو سراہا گیا۔ اس مجموعے میں مضامین کی جدت و نُدرت اور مختلف معاشی و معاشرتی اقدار کو اپنا موضوع بنا کر زندہ جاوید بنا دیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ احمد حسین مجاہد، انٹرویو، ایبٹ آباد، یکم جنوری ۲۰۲۲ء

۲۔ ایضاً

۳۔ پروفیسر بشیر احمد سوز، ہزارہ میں اُردو زبان وادب کی تاریخ، ادبیات مرکز تحقیق واشاعت، جون ۲۰۱۰ء، ص ۲۴۲

۴۔ پروفیسر ایوب صابرؔ، ادبستان ہزارہ، بزمِ اہلِ قلم مطبع گنج شکر پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۳۳۱

۵۔ احمد حسین مجاہد، انٹرویو، ایبٹ آباد، یکم جنوری ۲۰۲۲ء

۶۔ ایضاً

۷۔ ایضاً

۸۔ نذیر تبسم، سرحد کے اُردو غزل گو شعرا، تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی شعبہ اُردو، پشاور یونیورسٹی، ۲۰۰۳ء، ص ۴۳۶

۹۔ احمد حسین مجاہد، انٹرویو، ایبٹ آباد، یکم جنوری ۲۰۲۲ء

۱۰۔ پروفیسر ایوب صابرؔ، ادبستان ہزارہ، ص ۳۳۱

۱۱۔ احمد حسین مجاہد، انٹرویو، ایبٹ آباد، یکم جنوری ۲۰۲۲ء

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ پروفیسر ایوب صابرؔ، ادبستان ہزارہ، ص ۳۳۱

۱۴۔ پروفیسر بشیر احمد سوز، ہزارہ میں اُردو زبان وادب کی تاریخ، ص ۲۴۶

۱۵۔ احمد حسین مجاہد، انٹرویو، ایبٹ آباد، یکم جنوری ۲۰۲۲ء

۱۶۔ زوجہ احمد حسین مجاہد، انٹرویو، ایبٹ آباد، ۲۵ جنوی ۲۰۲۲ء

۱۷۔ احمد حسین مجاہد، انٹرویو، ایبٹ آباد، یکم جنوری ۲۰۲۲ء

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ احمد حسین مجاہد، انٹرویو، ایبٹ آباد، یکم جنوری ۲۰۲۲ء

۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ محمد حنیف، انٹرویو، شنکیاری (مانسہرہ)، ۱۰ فروری ۲۰۲۲ء

۲۲۔ احمد عطاء اللہ، انٹرویو، ایبٹ آباد، ۱۵ جنوری ۲۰۲۲ء

۲۳۔ احمد حسین مجاہد، انٹرویو، ایبٹ آباد، یکم جنوری ۲۰۲۲ء

۲۴۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، عکاس پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص۷۹

۲۵۔ ایضاً، ص۹۹

۲۶۔ ایضاً، ص۱۰۱۔ ۱۰۲

۲۷۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، سانجھ پبلی کیشنز، حفیظ پرنٹرز، لاہور، اشاعتِ اول، ۲۰۱۴ء، ص۷۵

۲۸۔ ایضاً، ص۹۱

۲۹۔ نذیر تبسم، سرحد کے اُردو غزل گو شعرا، ص۴۳۶

۳۰۔ ڈاکٹر سید علی سلیمان، تعارف: احمد حسین مجاہد، مشمولہ: روزنامہ اُردو لنک، یو۔ ایس۔ اے، اکتوبر ۲۰۰۳ء، ص۳

۳۱۔ حیدر قریشی، چند تاثرات از آصف ثاقب، مضمون مشمولہ: جدید ادب جرمنی، جنوری تا جون ۲۰۰۹ء، ص۱۱۶

۳۲۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص پس ورق

۳۳۔ ایضاً

۳۴۔ سہ ماہی فنون، لاہور، شمارہ ۱۱۰، جولائی ۱۹۹۹ء، ص۳۳۶

۳۵۔ نذیر تبسم، سرحد کے اُردو غزل گو شعرا، ص۵۵۴

۳۶۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص پس ورق

۳۷۔ ایضاً

۳۸۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص ۲۱

۳۹۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص پس ورق

۴۰۔ ایضاً

۴۱۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص ۱۶

۴۲۔ ایضاً، ص ۲۰

۴۳۔ ایضاً، ص ۲۲

۴۴۔ ایضاً، ص ۲۳۔۲۴

۴۵۔ افتخار مغل، مضمون، تازہ برف پر پھیلی دھوپ سی شاعری، مشمولہ: شعر و سخن، مانسہرہ، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۲ء، ص ۲۸

باب دوم

احمد حسین مجاہد کی شاعری: فکری مطالعہ

اُردو زبان و ادب جہاں نثر نگاری اپنے دامن میں مختلف موضوعات سموئے ہوئے ہے وہاں ساتھ ساتھ اُردو غزل کی صنف بھی مختلف فکری رجحانات سے مالا مال ہے۔ نثری اصناف کی فکری سطح کو بیان کرنے کے لیے نثر نگار جہاں لمبی چوڑی عبارات کا انتخاب کرتا ہے اس کے برعکس شاعر ایک آدھ مصرعے میں یا بعض اوقات شعر میں کسی ایک موضوع کو جامعیت کے ساتھ تاثراتی انداز میں بیان کر دیتا ہے۔

اُردو ادب میں کلاسیکی شعرا نے غزل جیسی صنفِ سخن کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ نظم نگار نے نظم میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ابتدا میں اصنافِ شاعری میں شاعر محض ادب برائے ادب کے تحت عشق و محبت اور فراق و وصال جیسے موضوعات کا انتخاب کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ فطرتاً شاعری نے انسانی فطرت کو نہ صرف قبول کیا بلکہ زندگی کے معاملات اور معمولات کو اپنے اندر جذب بھی کر لیا۔ اب نثر اور شاعری ادب برائے ادب کی بجائے ادب برائے زندگی کی ترجمانی کرنے لگے۔ جدید شعرا نے نہ صرف عشقِ مجازی بلکہ عشقِ حقیقی، انسانی زندگی اور انسان کے ارد گرد رونما ہونے والے حالات و واقعات جیسے مضامین کو قلم کی نوک سے مثلِ لہو قطرہ قطرہ بوند ٹپکا کر معاشرہ اور معاشرے کی پامال ہوتی ہوئی اقدار کو پیش کیا۔ یہی ان کی ان تھک محنت و جدوجہد کا ثمر ہے کہ شاعری میں نظم اور غزل کو جدید فکری رجحان سے متعارف کرا کے نہ صرف ادب کو دوام بخشا بلکہ ان اصناف کو بھی ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔

کلاسیکی شعرا کے مقابلے میں جدید شعرا نے شاعری میں ہر طرح کے موضوعات کو پیش کیا۔ انیسویں صدی کی زیادہ تر شعرا نے سماج اور سماج کے متعلق ہی قلم اٹھایا۔ یہ سفر چلتے چلتے عصرِ حاضر تک آن پہنچتا ہے۔ دورِ حاضر کے تمام شعرا کی شاعری اس بات کی غماز ہے کہ انھوں نے عصری شعور و آگاہی، سیاسی شعور، طبقاتی کش مکش اور شعور و ادراک جیسی فکری سطحات تک رسائی

حاصل کر کے عوام الناس کے اندر ایک خیال و فکر کی گہری سوچ قائم کر دی۔ عصرِ حاضر کے ان شعرا میں ایک اہم نام احمد حسین مجاہد کا ہے۔

احمد حسین مجاہد کی شاعری اپنے اندر تمام تر فکری رجحانات و میلانات کو جذب کیے ہوئے ہے۔ روایتی شاعری سے گریز کرتے ہوئے نت نئے موضوعات کا تعین کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں انسانی جذبات و احساسات کے گہرے اور دل چسپ مضامین کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ احمد حسین مجاہد کی فکری و فنی بصیرت و بصارت مکمل طور پر پختہ ہے۔ اس لیے گوہر رحمان نوید "صوبہ سرحد میں اُردو ادب" میں لکھتے ہیں :

> "ان کے ہاں بالغ نظر شاعری کا فن کارانہ احساس پورے سیاق و سباق کے ساتھ موجود ہے۔ لمحات رفتہ و گزشتہ کے علاوہ دورِ حاضر کے سارے دکھ اور سکھ کو انھوں نے بہت ہی جمال و جلال کے ساتھ پیش کیا ہے اور ان پر محاکات کی ایسی فسوں کاری کی ہے کہ ہر منظر دھند میں لپٹا ہوا ہونے کے باوجود ستھرا پاکیزہ اور صاف طور پر نظر آتا ہے۔ لمحۂ موجود کی منافقانہ روش ہر طرف پھیلی ہوئی گہری اداسی اور ذہنی و فکری ناآسودگی کے آسیب نے جس طرح ہر انسان کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے ان کے خلاف ایک مجاہدانہ ردعمل بھی ان کے اشعار سے عیاں ہے۔"(۱)

احمد حسین مجاہد کی شاعری میں اسلوب کی تازہ کاری اور مضمون کی آفرینی کے ساتھ ساتھ نئی تلازمہ سازی ہی ان کی شاعری کو حسن بخشتی ہے۔ اس حوالے سے چند فکری عناصر احمد حسین مجاہد کی شاعری سے منتخب کیے گئے ہیں جن کو کو راقم پیش کر کے ان کی شاعری کے مقام و مرتبے کا تعین کرے گا۔

۲.۱ عصری شعور

"عصر" عموماً زمانہ، وقت اور دور کے معنوں میں مستعمل ہے۔ لفظ "شعور" کے معنی سوجھ بوجھ اور باخبر رہنے کے ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں شعور سے مراد اپنے آپ سے اور ماحول سے باخبر رہنا ہے۔ انگریزی میں اسے Conciouness کہا جاتا ہے۔ شعور دراصل عقل، ذاتیت، فہم الذاتی، ملموسیہ، دانائی اورآگاہی کا نام ہے، جس میں انسان ذاتی و ماحولی حالتوں میں ایک ربط قائم کرتے ہوئے دوسروں کے دکھ درد اور حالات سے باخبر رہتا ہے۔

دورِ جدید کے اکثر شعرا اور ادبا کی تخلیقات عصرِ نو کے ڈھلتے سائے اور تقاضوں کو قبول کر رہی ہیں۔ ان تخلیقات و فن پاروں میں شاعری اور نثر دونوں پیش پیش ہیں۔ عہدِ حاضر کے شعرا نے اپنے عصری رسم و رواج اور تہذیب و ثقافت کو نہ صرف اپنی شاعری کا حصہ بنایا بلکہ عوام الناس کو بھی اس طرف متوجہ کیا کہ زمانے کے حالات وواقعات سے کیسے باخبر رہنا ہے۔ اپنے عصرِ حاضر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مستقبل کو بہتر کرنے کے لیے کیا اقدامات کیے جاسکتے ہیں۔

شعرا کے ہاں شاعری میں نہ صرف کسی ایک فرد، قوم یا ملک کے لیے نہ سوجھ بوجھ اور شعور کا عمل دخل ہے بلکہ عالمی سطح پر شاعر حالات وواقعات سے باخبر رہتے ہوئے تمام عامِ انسانیت کے لیے نت نئ اور مثبت راہوں کا تعین کرتا ہے۔ یہ حالات و وواقعات سماج اور ملک میں رونما ہوتے ہیں۔ جسے شعرا نے اپنے کلام میں اس انداز سے پیش کیا ہے کہ قاری یہ سمجھتا ہے کہ جیسے یہ افعال محض اُس پر نہیں بلکہ تمام عالمِ انسانیت اس کی گرفت میں ہے۔ یہ حالات وواقعات مثبت انداز میں بھی رونما ہوتے ہیں اور بعض اوقات زوال کا بھی شکار ہوتے ہیں۔ ان شعرا میں ایک اہم اضافہ احمد حسین مجاہد کا بھی ہے، جن کی شاعری اس بات کی غماز ہے کہ ان کے ہاں عصری شعور کا عنصر

نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں زمانے کا شعور ہے اور حالات وواقعات سے بخوبی آشنا ہیں۔ زمانے کا کرب و ملال، ظلم و جبر، عدل و انصاف، سماجی مسائل اور درد و الم سے واقفیت رکھتے ہیں اور یوں کہہ اٹھتے ہیں:

اس کو طرح ملی مرے فکر و شعور سے
جو فیصلہ بھی وقت کے ایوان میں ہوا (۲)

احمد حسین مجاہد کا کلام عصری شعور سے بھرا پڑا ہے۔ اپنی شاعری کے ذریعے اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ اگر لوگوں میں فکر و شعور نہ ہوا تو ان کے لیے زمانے کی راہیں چلنا دشوار ہو گا۔ اس لیے کہ زمانے کا شعور اور سمجھ اتنی ہی لازم ہے جتنا کہ سانس۔ اس وجہ سے وہ بلا جھجک اور بے خوف و خطر عوام میں شعور بیدار کرنے کے خواہاں ہیں اور کہتے ہیں:

میرے بوجھل پاؤں گھنگھرو باندھ کے ہلکے ہوئے
سوچنے سے کیا نکلتا دِل میں ڈر رکھا ہوا (۳)

عصری شعور زمانے کی وہ سمجھ بوجھ ہے جس کو شاعر نے اپنی نگاہِ بسمل سے دیکھا اور ان تمام امور کو صفحۂ قرطاس پر مرتسم کر دیا۔ فکر و خیال سے اس بات کو واضح کر دیا کہ انسان جس معاشرے میں جی رہا ہے اس معاشرے و سماج میں اس قدر صعوبتیں اور کٹھن راہیں جنم لیتی ہیں کہ انسان گناہ تو کیا اپنے حق کے لیے آواز بھی بلند نہیں کر سکتا۔ اس لیے احمد حسین مجاہد کہتے ہیں :

گناہ کر نہیں سکتا، گناہ سوچتا ہوں
میں کیا کروں مری اوقات ہی کچھ ایسی ہے
دُعا کو ہاتھ اٹھاؤں تو دل لرزتا ہے
خدا سے کیسے کہوں بات ہی کچھ ایسی ہے (۴)

مندرجہ بالا اشعار میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ انسان بے بس و بے یار و مدد گار ہے۔ انسان کی اہمیت کم سے کم تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ شاعر بارگاہِ الٰہی میں ہاتھ پھیلائے زمانے کے دکھ درد ختم کرنے کے آرزومند ہیں مگر حالات اس قدر پیچیدہ اور ناگزیر ہیں کہ ہاتھ اٹھانے میں عار محسوس ہو رہی ہے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی توضیح ہوتی ہے کہ دورِ جدید میں پامال ہوتی اقدار اور عالمِ انسانیت کے درمیان ناکشیدہ حالات، ظلم و جبر، ناانصافی اور قتل و غارت جیسے عناصر نے جنم لیا ہے۔ شاعر اس فکر و خیال میں ہے کہ اس بے شعور سماج و معاشرے میں شعور لا کر ان تمام منفی پہلوؤں کا خاتمہ کیا جائے۔ احمد حسین مجاہد کے کلام میں عصری شعور جیسے عنصر کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ اس حوالے سے احمد حسین مجاہد کے چند منتخب اشعار ملاحظہ کیجیے:

کچھ ایسے آسماں میرے شانے پہ آ گیا
اندھے کا پاؤں جیسے خزانے پہ آ گیا
نادیدہ ہاتھ میرے گلے تک پہنچ گئے
ہستی کا بوجھ جب میں اٹھانے پہ آ گیا (۵)

اسے نہیں کوئی نسبت مرے قبیلے سے
جو زندگی کو گزارے ذرا ذرا کر کے (۶)

خون جلنے کی بو آتی ہے لفظوں سے
میں بھی جانے کیا کیا لکھتا رہتا ہوں (۷)

مندرجہ بالا اشعار اس بات کی توضیح کرتے ہیں کہ شاعر کے نزدیک کا غم ہی دراصل ایک المیہ بن کر رہ چکا ہے۔ شاعر کی آہ و فغاں اور چیخ پکار اس بے شعور زمانے پر کوئی اثر نہیں رکھتی بلکہ یہ زمانہ سنگ دل اور اندھا ہو چکا ہے۔ دوسروں کا حق چھیننے کے لیے ان کے ہاتھ اب گلوں تک پہنچ رہے ہیں۔ شاعر کے ہاں وہ طبقہ جس پر حق بات کو کوئی اثر نہیں اور شعور سے بے شعوری کی طرف

مائل ہے، اس طبقے کے لیے علی الاعلان کہہ رہے ہیں کہ ان کا تعلق ہماری تہذیب و تمدن، سماج، زمانہ اور قبیلے سے نہیں بلکہ ان کا تعلق اس ظالم طبقے سے ہے جو ہمیشہ مظلوم طبقے کا حق مارتے ہیں اور ظلم و جبر کے درپے رہتے ہیں۔ قتل وغارت گری اور لوٹ مار اس زمانے کا رواج بن چکا ہے ۔ اس لیے شاعر اس بات کی ترجمانی کرتا ہے کہ میرے الفاظ بھی اسی معاشرے کا دین ہیں جن سے انسانی لہو کی خوشبو آتی ہے۔ یہ واضح کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ ہمارا یہ ظلم و تشدد اور ناچاکیاں کب ختم ہوں گی لیکن لوگوں کے ہاتھ گلے تک پہنچ آتے ہیں۔ میں کس کس کا بوجھ اٹھاؤں اور کیا کیا لکھوں؟

احمد حسین مجاہد کے کلام میں عصری شعور کی جھلک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ قارئین کے دل و دماغ پر یہ جھلک گہری چھاپ قائم کرتی ہے جس سے واضح نظر آتا ہے کہ احمد حسین مجاہد کے ہاں فکری عناصر کی فراوانی ہے اور وہ انھیں بیان کرنے کا ڈھنگ جانتے ہیں اور کہہ اٹھتے ہیں:

نامعتبر حوالہ ہیں میرے مشاہدات
دیکھی ہے میں نے روزنِ زنداں سے کائنات (۸)

یہ واقعہ ہے خیال اس کو تب اپنا آیا
جب اپنے بارے میں اس نے میرا خیال دیکھا (۹)

ہر گام پہ اگتا ہے کوئی وہم نیا
آتی ہے نظر دشت میں دیوار مجھے
وجدان کی آواز کا ابلاغ کروں
"اے کاش کہ ہو سہل یہ کردار مجھے (۱۰)

احمد حسین مجاہد اس فکر وخیال میں ہیں کہ اب انھیں زمانے کا غم ہے۔ جان ہتھیلی پہ لیے۔ سر پر کفن باندھے اس کوشش و جستجو میں ہیں کہ اگر انھوں نے زمانے کے دکھ درد و رنج والم کے لیے آواز اٹھائی اور جان بھی چلی گئی تو پرواہ نہیں۔ اس لیے شاعر بے دھڑک وخوف و خطر کہتا ہے:

میں وہ بزدل ہوں جو ظالم کی حمایت میں اٹھا
اب مرا سر کسی مینار میں کام آئے گا
اک دِیا ہے جو پسِ چشم فروزاں ہے کہیں
یہ دِیا کل تری سرکار میں کام آئے گا (۱۱)

چپ لگی ایسی کہ پوچھا بھی تو بولا نہ گیا
میں نے پہلے تو بہت شور مچایا تھا (۱۲)

تلوار عُدو کی تھک گئی ہے
پھر فصل سَروں کی پک گئی ہے
اب زہر ملے تو وہ بھی پی لُوں
تالو سے زباں چپک گئی ہے
بے درد! طلوع ہو کہیں سے
اب آگ بہت بھڑک گئی ہے (۱۳)

احمد حسین مجاہد نے عصری حالات و واقعات کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ زمانے کا کرب جانتے ہیں مگر یہ میرِ کارواں ہے کہ اپنی دُھن میں مگن ہے۔ شاعر کے نزدیک اب وہ وقت قریب آن پہنچا ہے کہ زمانہ زوال کا شکار ہونے والا ہے۔ چاروں طرف ظلمت کی آگ بھڑک اٹھی ہے جس سے نہ صرف خاندان بلکہ قومیں اور ملک تباہ و برباد ہونے جا رہے ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے کھودے گڑھے اور بُنے جال میں خود پھنسنے والے ہیں۔ ہر ناممکن کوشش کے بعد "ایھاالناس" کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

کہ خلقِ خدا ایک بار پھر
اپنے خدا کی منتظر ہے
دوسرے دیسوں سے آئے قافلے
کب تک بروئے کار آئیں گے ؟

چٹختی پسلیوں کے روزنوں سے

بھوک باہر جھانکتی ہو گی

سرک کر گوڈری سائے میں

درویش کے پیروں سے لگ کر پوچھتے ہوں گے

خدا کب آئے گا؟ (۱۴)

شاعر نے ایک ایسے قافلے اور میرِ کارواں کا منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی ہے جو غربت و افلاس کی وجہ سے غریب سے غریب تر ہوتا جارہا ہے جب کہ امیر، امیر سے امیر تر۔ غریب طبقہ کسی خدا کی تلاش میں ہے، کسی رہبر ورہنما کی جستجو میں ہے جب کہ امیر و اعلیٰ طبقہ بہرہ و گونگا ہو کر کارِ جہاں سے غافل اور بے نیاز ہے۔

احمد حسین مجاہد کی شاعری میں عصری شعور اور اس کے پیشِ نظر ہونے والے مسائل کے عناصر جابجا دکھائی دیتے ہیں جنھیں شاعر نے عمدگی اور خوب صورتی سے پیش کر کے قارئین کے دلوں کو نہ صرف جیتا ہے مگر اس سوچ و فکر کی دعوت بھی دے رہے ہیں کہ مسائل کا حل تلاش کر کے بروقت ان پر قابو پا کر مستقبل کی راہوں کا صحیح تعین کیا جائے تا کہ ایک صحت مند اور ترقی یافتہ معاشرہ قائم ہو سکے۔

۲.۲ رجائیت

عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی امید و بیم کی کیفیت، پُر امید، خوش خیالی اور خوش گمانی کے ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں رجائیت سے مراد نیکی کا بدی پر غالب آجانا یا ہر معاملے کا انجام بہتر ہونا ہے۔ "کشاف تنقیدی اصطلاحات" میں داکٹر ابو الاعجاز حفیظ صدیقی رجائیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

"اشیا و واقعات کا روشن پہلو دیکھنا اور مستقبل کے بارے میں
پر امید نقطۂ نظر رکھنا رجائیت کہلاتا ہے۔"(۱۵)

اُردو شاعری کے بعض شعرا کے ہاں رجائیت کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ ان شعرا میں علامہ اقبالؒ کا نام سرِ فہرست ہے، جنھوں نے نہ صرف مجہولی رجائیت کے عمل کو بجالایا بلکہ وہ فعالی رجائیت کے بھی حامی تھے۔ مجہولی رجائیت سے مراد وہ عمل جس میں شاعر کسی خاص کروٹ اور وقت کا انتظار کر رہا ہو جب کہ فعالی رجائیت سے مراد وہ کوشش ہے جس میں شاعر بہتر مستقبل کے لیے اپنی ناکامیوں کے باوجود بھی اپنی کامیابی پر مکمل یقین رکھتا ہو۔ بہت سے شعرا کے ہاں رجائیت کا عنصر نمایاں ہے مگر یہ عنصر زیادہ تر مجہولی کیفیت کو ظاہر کر رہا ہوتا ہے۔

احمد حسین مجاہد کے کلام میں مجہولی کیفیت کم مگر فعلی اور عملی رجائیت کا رنگ غالب ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ شاعر اپنے مستقبل کو روشن اور بہتر کرنے کے لیے عملی طور پر کوشاں ہے۔ ان کے ہاں عصری شعور کی طرح رجائیت کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ ظلم و جبر اور قتل و غارت گری، معاشرے کی پامال اقدار کو تبدیل کرنے اور آئندہ کے لیے ان منفی عناصر کا خاتمہ دراصل ان کی شاعری کو محور ہے۔ شاعر آخری سانس تک خونِ جگر ایک کر کے اس کارِ خیر میں مصروف ہے جس میں معاشرے کے لیے امن و فلاح ہے۔ رجائیت کے حوالے سے احمد حسین مجاہد کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے :

وقت کی رفتار ہو جاؤں گا میں
اتنا پراسرار ہو جاؤں گا میں
جیسے میرا خواب ہے یہ زندگی
جیسے اب بیدار ہو جاؤں گا میں

بے نیازانہ گزر جائے گا تُو
گاؤں کا بازار ہو جاؤں گا میں (۱۶)

گو تاب نہیں سانس لیے جاتا ہوں پھر بھی
وہ جائے بھرم کچھ تو تری چارہ گری کا (۱۷)

ہوائے صبح کے چہرے پہ خاک اڑتی ہے
عذابِ در بدری جانے اب کہاں لے جائے

سوادِ دستِ تحیر میں کوئی پھول کھلا
ورائے حدِ بیاں! مجھ پہ منکشف ہو جا (۱۸)

میں بولتا نہیں، بس دیکھتا ہوں حیرت سے
کسی پہ کھلتا نہیں پھر بھی مدعا میرا (۱۹)

آسمانوں سے فرشتہ تو نہیں اترے گا
شعر اتریں گے، صحیفہ تو نہیں اترے گا

پار جانا ہے تو دریا میں اترنا ہوگا
سوچتے رہنے سے دریا تو نہیں اترے گا (۲۰)

پَس افق سہی لیکن کہیں اجالا ہے
ہماری فکر کا سورج نکلنے والا ہے

جہاں جہاں ہے اندھیرا مجھے وہاں سے گزار
یہ روشنی تو میرا دائمی حوالہ ہے (۲۱)

مندرجہ بالا اشعار سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ شاعر کے ہاں فعلی و عملی رجائیت موجود ہے۔ زمانے کے حالات سے باخبر ہیں۔ ان حالات کا جائزہ لیتے ہوئے وہ اپنے کلام میں اس فکری رجحان کو پیش کرتے ہیں۔ احمد حسین مجاہد کے کلام میں زمانہ اور اس کا غم اور یہ غم مستقبل کے لیے مثبت اور عملی امید لے کر ایک خوشی و

مسرت کی لہر پیدا کرتا ہے۔ وہ دور افق پر کسی ٹمٹماتے ستارے کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ اب اندھیرا رفتہ رفتہ ختم ہو گا اور ایسا سورج نکلے گا جو تمام عالمِ انسانیت کو منور کر کے اس کے سارے اندھیرے ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا۔ دراصل شاعر کا یہ استعاراتی و علاماتی انداز اس غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کہ اب باطل کو شکست ہو گی اور حق کو فتح ہو گی۔ تاریکیاں اور اندھیرے ختم ہوں گے اور ہر طرف امن و خوش حالی سے پُر امن ماحول پیدا ہو گا۔ ظلم و جبر اور ناانصافی کے بنائے تمام جھوٹے اور باطل پھندے ٹوٹ جائیں گے۔ اس لیے احمد حسین مجاہد اس کے خلاف آواز اُٹھاتے ہوئے کہتے ہیں:

اگرچہ یہ میری کوشش کی انتہا نہ تھی
وہاں چراغ جلایا جہاں ہوا بھی نہ تھی
مجھے اتار گیا تھا اِک ایسی بستی میں
جو مجھ سے پہلے محبت سے آشنا بھی نہ تھی (۱۱)

احمد حسین مجاہد اپنی تمام تر توانائی ایک ایسے معاشرے کے لیے صرف کر رہے ہیں جو نفرت اور لاتعلقی کی بنسبت زوال پذیر ہوتا جا رہا ہے مگر دوسری طرف شاعر کا امیدانہ اور رجائی عنصر اس نفرت اور خود غرضی کو محبت و الفت میں تبدیل کرنے کا غماز ہے۔ اگر اس رجائی اندازِ فکر کو ان کی شاعری سے نکال دیا جائے تو ان کی شاعری کا رنگ پھیکا پڑ جائے گا۔ اس لیے کسی بھی شاعر کی شاعری کا نمایاں رنگ رجائیت ہی ہوتا ہے۔ یہ رنگ چاہے فعلی ہو یا مجہولی، دونوں طرح سے شاعر کے کلام کو چار چاند لگانے کے ساتھ ساتھ قوم و سماج کے اندر جذبات کی لہر پیدا کرتا ہے۔ نتیجتاً یہ جذبات مثبت اور پُر امن انقلاب پیدا کر کے ایک بہترین ملک و معاشرے کی تشکیل و ارتقا میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

۲.۳ ہجر ووصال

اُردو ادب کی شاعری میں ہجر و وصال کے موضوع کو بیش تر شعرا نے عمدگی سے برتا ہے۔ یہ ایک ایسا پہلو ہے جس کے بغیر اُردو شاعری کا رنگ ہلکا اور پھیکا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی ادبی اصطلاح ہے کہ جس میں شاعر اپنے محبوب سے جدائی اور ملاقات کا تذکرہ بیان کرتا ہے۔

ہجر اصل لفظ عربی سے مشتق ہے جس کے معنی جدائی کے ہیں لیکن اصطلاح میں ہجر سے مراد محبوب سے جدائی ہے۔اس کے برعکس لفظ وصلا "وصل" سے نکلا ہے جس کے معنی ملاقات، بھینٹ اور عاشق معشوق کی محبت کے ہیں۔

اُردو ادب کے آغاز ہی سے شعرا کے ہاں ہجر و وصال کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ کلاسیکی شعرا اور پھر جدید شعرا کے ہاں تو ہجر و وصال کا ایک باقاعدہ موضوع ملتا ہے۔ اسی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے عصرِ حاضر کے شعرا نے بھی اس موضوع کو اپنایا مگر کلاسیکی شعرا کے مقابلے میں جدید شعرا نے اس عنصر کو ایک نئے اور منفرد تجربے سے پیش کیا۔ موضوع اگرچہ قدیم ہے مگر دورِ جدید میں شعرا نے اس سلیقے سے اسے برتا ہے کہ جیسے بالکل کوئی نیا عنوان ہے۔

احمدؔ حسین مجاہد کا کلام بھی ہجر و وصال کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ ان کی شاعری میں ہجر و وصال کی داستان گویا ان کے کلام کی شان ہے۔ اگرچہ انھوں نے دیگر موضوعات کو بھی زندہ جاوید بنادیا ہے مگر محبوب سے بچھڑنا، جدائی، مفارقت اور ملاقات و رازو نیاز کی باتیں اس اسلوبِ بیان سے رقم کی ہیں کہ جیسے خود قاری پہلی مرتبہ کہیں درد و الم اور خوشی و مسرت کے زینوں سے گزر رہا ہو۔ لطف و کرم اور داغِ مفارقت جیسے ابھی ابھی خود اپنی نگاہوں سے ذاتی توجہ کا مرکز بن گیا ہو۔ اس حوالے سے احمد حسین مجاہد کے چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ رات ہجر کی آنکھوں میں کاٹ دی میں نے
طلوعِ صبح کے امکان کے بغیر میاں (۲۳)

جلتا رہتا ہے دیا ہاتھ میں، آنکھوں میں دماغ
حجرۂ ہجر میں اب رات نہیں بھی ہوتی (۲۴)

وہی پاؤں چومے تھے جو کبھی میں نے اضطراب وصال میں
وہی پاؤں جاتے ہوئے کوئی مرے دل پہ رکھ کے گزر گیا (۲۵)

پہلے شعر میں شاعر نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ محبوب کی جدائی میں جوں توں کر کے رات کاٹ دی ہے اور صبح کا انتظار تک نہیں کیا۔ اسی طرح دوسرے شعر میں شاعر نے یہ حکایت بیان کی ہے کہ محبوب کی مفارقت میں اس قدر گم تھا کہ ہاتھ میں چراغ لیے بیٹھا رہا اور دل و دماغ اور آنکھوں میں ایک تصویر بناتا رہا مگر جدائی کا گھر ایسا راستہ اختیار کر چکا ہے کہ اب اس گھر میں کوئی روشنی نہیں ہونے والی اور جدائی کا تاریک حجرہ کبھی روشن نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح شاعر کے نزدیک جن کو وہ اپنا دین ایمان سمجھ بیٹھے تھے اور وہ جو دورانِ ملاقات حوصلہ بڑھاتے اور زندگی کی رعنائیاں بتاتے تھے آج ایک ایسا وقت آن پہنچا ہے کہ وہ شخص سب کچھ بھول کر دل کو ایسے توڑ گیا ہے کہ جیسے کبھی وہ آشنا ہی نہ تھا۔

احمد حسین مجاہد کے ہجر و وصال کے قصے بنیادی طور پر مفکرانہ جہت کے اظہار کا وسیلہ ہیں۔ ان کا یہ اندازِ فکر قاری کے دل و دماغ پر ایک اثر قائم کرتا ہے اور پڑھنے سننے والے پر تادیر والا ایک نقشِ یار میں ڈوب کر رہ جاتا ہے۔ اس حوالے سے احمد حسین مجاہد لکھتے ہیں:

بچھا ہے جسم میں بارود ہر طرف سائیں
بجز مرے، مرا کوئی نہیں ہدف سائیں

اک اپسرا ہے اداسی کی خیمہ زن مجھ میں
ہر اک سانس ہے اس ساحرہ کا دف سائیں (۲۶)

اور بھی لوگ تھے جنھیں عشق کا زعم تھا مگر
راہوں کی گرد ہو گئے کارِ محال کے نثار

ہجر بھی عین وصل ہے وصل بھی ایک خواب ہے
جو بھی ہے اس کے دم سے ہے اپنے خیال کے نثار (۲۷)

پلٹتی کرنوں میں ایسا الجھا کہ میں نے احمدؔ
نہ اس کو دیکھا نہ اس کے شیشے میں بال دیکھا (۲۸)

پہلا مکالمہ یہ میرا سکوت ہے
اے ہجر یار آج ہے کسی معرکے کی رات (۲۹)

پلکوں پہ دائروں کے سفر کی سیاہ گرد
آنکھوں میں خوابِ وصل سے الجھے ہوئے عذاب (۳۰)

مندرجہ بالا اشعار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ احمد حسین مجاہد کے کلام میں ہجر و وصال کے عنوان کو جس سلیقے سے برتا گیا ہے وہ نہایت ہی سادہ اور سہل طرزِ بیان ہے۔ ان کے ہاں یہ وہ سچی داستان ہے جو کبھی ختم نہیں ہونے والی۔ کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کے بیش تر حالات و واقعات ہجر و وصال کے گرد گھومتے ہیں۔ جس طرح مندرجہ بالا شعر پڑھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ شاعری زندگی میں ہر طرف ایک بارود (بد نظمی و انتشار) پھیلا ہوا ہے، جس کے تحت وہ اپنا آپ ہی سب کچھ ہے۔ ہجر کو وصل اور وصل کو ہجر ایک ہی چیز قرار دیتے ہیں کہ ملنا بھی جدائی ہے اور جدائی نام ہی وصل یعنی ملاقات کا ہے۔ اپنی آنکھوں اور پلکوں پر ہمیشہ ہجر اور خوابِ وصل کے خواب سجائے رکھتے ہیں۔ وہ اپنے آپ سے تنہائی میں باتیں کرتے ہیں

اور پلٹتی کرنوں میں جمالِ یار کا عکس تلاش کرتے ہیں۔ اگر کوئی دوسرا شخص بھی اپنی جدائی کا حال بیان کرتا ہے تو وہ اسے بھی اپنا سمجھ بیٹھتے ہیں اور اندر سے مکمل طور پر کہہ اٹھتے ہیں:

ابھری ہوئی تھیں چاند کے ماتھے پہ سلوٹیں
مجھ کو نہ اپنا نہ یاروں کا پاس تھا
سب مل کے گا رہے تھے جدائی کا ایک گیت
خیمے میں دَف بجا تو میں کتنا اداس تھا (۳۱)

احمد حسین مجاہد کے ہاں ہجر و وصال کا عنصر دوسرے موضوعات سے نمایاں نظر آتا ہے۔ اپنی شاعری کے ذریعے وہ اپنے تمام واقعات کو بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ اگر وصالِ یار ممکن نہ ہو تو یہ ضروری نہیں کیوں کہ وہ یہ کہہ اُٹھتے ہیں:

کہاں صورت گری ممکن ہے خوابِ وصل کی احمدؔ
یہی کافی ہے اس کا تذکرہ اشعار میں آئے (۳۲)
اسے تو خوف تھا بس چار گام چلنے کا
ہم اپنے دل میں بچھڑنے کا ڈر بھی رکھتے تھے (۳۳)

شاعر نے ہجر و وصال کے مضامین کو جہاں خوب صورتی اور حسن کا جامہ پہنایا ہے وہاں وہ ساتھ ساتھ یہ اندیشہ بھی رکھتے ہیں کہ زندگی میں یہ نشیب و فراز تو آتے ہی رہتے ہیں مگر وہ شخص تو چار قدم چلنے سے ڈر رہا تھا مگر اک میں تھا کہ وہ مجھ سے ملنے کے بعد بچھڑ نہ جائے۔ مگر یہ ایک فطری امر ہے کہ اگر ہجر ہو گا تو وصال بھی ہر صورت ہو گا اور جب وصال ہو گا تو پھر یہ ہجر میں بدل جائے گا۔ اس طرح شاعر ان تمام تر حالات سے اکتا کر اپنے آپ کو کوستا ہے اور کہتا ہے کہ کاش میں پیدائشی گونگا ہوتا اور آج یہ نوبت نہ آتی۔ جیسے:

جی بھر کر تمھیں دیکھ لیا کرتا کہیں پر
اظہارِ محبت کا گنہگار نہ ہوتا
تم بھی مری چپ چاپ محبت نہ سمجھتے
میں بھی کسی وعدے کا طلب گار نہ ہوتا (۳۴)

مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ احمد حسین مجاہد کا کلام ذاتی اور غیر ذاتی امکانات کے تصرف میں ہر قلبِ حیات کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ ان کی دقتِ نظر کا گواہ بن کر سامنے آتا ہے ۔ جس طرح ہجر و وصال دونوں کو عین یکساں قرار دیتے ہوئے پھر ان کا تجزیہ کر کے لازم و ملزوم لاتے ہیں۔ اکثر مقامات پر اس سے غافل اور بے نیاز ہو کر نت نئی راہوں کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ بعض دفعہ تو اس موضوع کے بالکل انکاری معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کش مکش جاری و ساری ہے اور مطالعہ کرنے والے کو یہ موضوع جدت اور تنوع میں نظر آتا ہے جو شاعر کا ایک منفرد اور الگ طرزِ اسلوبِ بیان ہے۔

۲.۴ عشق و محبت

احمد حسین مجاہد بنیادی طور پر ایک خوش فکر اور خوش طبع شاعر ہیں۔ ان کا یہ مزاج ان کی شاعری کا مکمل آئینہ دار ہے۔ وہ ہر موضوع کو خندہ پیشانی سے رقم کرنے کا فن جانتے ہیں۔ ان کی شاعری کا بنیادی عنصر ہجر و وصال ہے مگر ان کی ایک اساس "عشق و محبت" پر بھی مبنی ہے۔ یہ وہی عشق ہے جو اذانِ بلال میں جھلکتا ہے اور خلقِ خدا کو فرماں بردار بنا دیتا ہے۔ شاعر نے اپنے کلام میں بیش تر عشق ہی کے رنگ و بو سے کام لیا ہے۔ یہ عشق دیگر شعرا سے منفرد خصوصیت رکھتا ہے۔ ان کے حسنِ عشق و محبت کے حوالے سے گوہر رحمان نوید لکھتے ہیں:

"ہماری غزل کی روایت میں اکثر شعرا اپنے محبوب کے عشق میں

ایسے رسوا ہوئے کہ اپنی عزت سادات تک داؤ پر لگا آئے اور پھر
اپنی آشفتہ سری کے لیے کسی سنگ مداوا کی تلاش میں عمر بھر
سرگرداں رہے لیکن دوسری طرف مجاہد کا عشق ہے جو تمام
کلاسیکی حوالوں کے باوجود اپنے اندر کئی طرح کی توانائیاں رکھتا
ہے۔"(۳۵)

احمد حسین مجاہد کی شاعری میں عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی دونوں مباحث بیک وقت ایک ہی مدار میں چل رہے ہوتے ہیں۔ یہ عشق محض انھیں چھو لینے اور محسوس کرنے پر ہی لطف و سرور دیتا ہے۔ اس حوالے سے احمد حسین مجاہد کچھ یوں گویا ہیں:

آنکھیں وہ گہری، زلفیں سنہری، وہ اس کی مستانہ چال
ہونٹوں سے ٹپکے انگور کا رَس، اُس پر زمانہ مرے
کر کے اشارہ، مجھ کو دوبارہ، اٹھ کے چلی جائے وہ
گڑیا کی شادی رہ جائے آدھی، الزام مجھ پہ دھرے (۳۶)

وہ حُسن کے تقدس سے شرم سار تھا عشق
اب اس کی آنچ مرے دل کو گدگداتی ہے (۳۷)

اشکِ خوں کی سیر مژگان سے ہے احمد آبرو
ورنہ میرا عشق تو محتاج رسوائی نہیں (۳۸)

کرتے ہیں عشق ایک تغافل شعار سے
ہم برف میں کچھ آگ ملائے ہوئے تو ہیں (۳۹)

احمد حسین مجاہد کی شاعری عشق و محبت کی بھرپور غماز ہے۔ جس طرح ہجر و وصال کے ذائقے محسوس کرتے ہیں اسی طرح لاحاصلی اور عشق و محبت کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔ اگرچہ عشق و محبت بھی شاعری میں روایتی مضمون ہے۔ مگر شاعر اس موضوع میں الفاظ کے شتر اور بے مہار نہیں برتتے بلکہ

ایک نئے انداز اور پیرائے کا استعمال کرتے ہوئے اس موضوع میں جدت لاتے ہیں۔ جیسے مندرجہ بالا اشعار اس بات کا جواز پیش کر رہے ہیں اور شاعر کا عشق دوسرے شعرا سے قدرے مختلف اور الگ ہے۔ اس حوالے سے چند منتخب اشعار دیکھیے:

تشکیلِ خدوخال انَا عشق سے ہوئی
ہستی فَنا کے غم سے ورا عشق ہوئی
باطل ہوئے طلسم تری اک نگاہ سے
پتھرا گئی تھی سوچ، صدا عشق سے ہوئی
سینہ یقیں کے تخم نے چیرا زمین کا
وہم و گماں سے عقل رہا عشق سے ہوئی (۴۰)

مندرجہ بالا غزل کا مطالعہ کیا جائے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے احمد حسین مجاہد نے عشق و محبت کے عنوان سے ایک نظم رقم کی ہے جس میں انھوں نے وارداتِ قلبی اور عشق کی تشکیل کے ان عناصر کو زیرِ بحث لایا ہے جو کسی عاشق کو درکار ہوتے ہیں مگر یہ کلام بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے کہ وہ بیک وقت نظم نگار اور غزل گو شاعر ہیں۔ وہ جو بھی موضوع تخلیق کرتے ہیں اس کے لیے ایک الگ اور منفرد اندازِ بیان اختیار کرتے ہیں۔ گویا موضوع جتنا بھی قدیم کیوں نہ ہو نت نیا معلوم ہوتا ہے۔ درج ذیل نظم ان کے اندازِ بیان اور عشق و محبت کے تمام عناصر کی حامل ہے:

محبت ہے، محبت ہے
مجھے تم سے محبت ہے
بس اتنی بات کہنا ہے
کس قدر دشوار ہوتا ہے
بس اتنی بات ساری زندگی کا روگ بنتی ہے

بس اتنی بات سے سارے تعلق
ٹوٹ جاتے ہیں
جنھیں اپنا بنانا چاہتے ہیں
روٹھ جاتے ہیں (۴۱)

احمد حسین مجاہد کا عشق مجازی نہایت پاکیزہ و نفیس ہے۔ وہ قربِ الٰہی تک پہنچنے کے لیے مجازی عشق کو اولیت زینہ پر فائز کرتے ہیں۔ جب تک انسان خدا کے بندوں سے ہمدردی و محبت سے پیش نہیں آئے گا اس وقت تک عشق حقیقی کی وسعتوں کو پانا دشوار ہو گا۔ شاعر کا یہ تصورِ عشق، مجازی و حقیقی دونوں حدود پر مشتمل ہے اور شاعر کہہ رہے ہیں:

مجھ بے ہنر سے عشق نے منسوب کر لیا
اندھی عقیدتوں کے طلسمات سے گریز (۴۲)

یہ واقعہ ہے کہ اک اور شخص کا محبوب
کہ جس سے اور کسی کو بہت محبت تھی
لپٹ کے مجھ سے جو سویا، تو میں بہت رویا
خدا کو اتنے تکلف کی کیا ضرورت تھی (۴۳)

کسی بھی شاعر کی شاعری کا وجود اور شخصیت کا عکس اس کے حسن و عشقِ محبت پر اپنا رنگ دکھاتا ہے۔ احمد حسین مجاہد کے ہاں بھی عشق و محبت کے بیش تر عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ وہ اطاعتِ الٰہی کے لیے عشق کو بنیادی امر تصور کرتے ہیں اور پھر اس راستے پر چل کر خالقِ حقیقی کی پہچان کو اصل منصب قرار دیتے ہیں۔ ان کا تصورِ عشق و محبت عملی طور پر انسان کی مخفی حقیقتوں اور ظاہری حسن و جمال پر مفکرانہ دعوت دیتا ہے کہ کائنات میں موجود ہر شخص کے اندر پوشیدہ سربستہ راز ہیں جن کی انھیں خود خبر نہیں۔ اگر یہ راز ہر انسان پر ظاہر ہو جائے تو وہ عشقِ مجازی کے ساتھ

ساتھ عشقِ حقیقی کے دریچوں کو بھی وا کر دے گا۔ اسی طرح اصل اور ظاہری حسن و جمال بھی ایک فطری عمل ہے۔ مگر یہ ظاہری و باطنی رعنائیاں انسان کی ارفع ترین صورتِ حال کی غماز ہوتی ہیں۔ چاہے ان کو منفی طریقے سے استعمال کرے یا پھر مثبت سلیقے سے برتے۔

احمد حسین مجاہد عشق و محبت کو اپنے کلام میں اس قدر سوز و گداز اور پھوٹتی ہوئی کلی کی مثل بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے اور سننے والا اس اثر کو جلد قبول کر لیتا ہے۔ ان کا عشق و محبت ہی وہ واحد وسیلہ ہے کہ جس کے ذریعے وہ مخلوقِ خدا اور ذاتِ باری تعالیٰ کے حقیقی اور فطری کائنات نظام کی تصدیق کرتا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ احمد کی شاعری کا یہ منفرد رنگ گل و بو ہی وہ مہک ہے جو ان کے پورے کلام پر حاوی ہے۔ اس کی مہک سے قارئین نہ صرف لطف و سرور حاصل کرتے ہی بلکہ عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی کے مراحل سے بھی آشنا ہو جاتے ہیں۔

۲.۵ شعور وادراک

شعور و دراک ایک مرکب ہے جس کے لفظی معنی عقل، دانائی، فہم اور حقائق کو جاننے کی صلاحیت کا نام ہے۔ شعور وادراک کو ہم اصطلاحی معنوں میں یوں بیان کریں گے کہ وہ ادبی اصطلاح کہ جس میں شاعر یا ادیب اپنے اندازِ فکر کو اس طرح بیان کرے کہ جس میں وہ اپنے ہوش و حواس میں رہتے ہوئے اپنے ماحول، حالات اور ارد گرد کے واقعات کو حاضر دماغی اور مکمل صحت سے بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

شعور وادراک کا عنصر عام طور پر کم لوگوں میں پایا جاتا ہے مگر جو لوگ عقل و شعور رکھتے ہیں ان کے ہاں یہ عنصر نہ صرف عملی طور پر افعال سر انجام دیتا ہے بلکہ ان کے ہاں یہ ایک متحرک اور ٹھوس اقدامات کے قابل بھی ہوتا ہے۔

احمد حسین مجاہد کے ہاں بھی دیگر موضوعات کی طرح یہ عنوان بھی متحرک اور ٹھوس بنیادوں پر استوار ہے۔ وہ قولی اور فعلی طور پر عوام کے اندر شعور وادراک کی پرتیں چاک کرتے نظر آتے ہیں۔ سماج کے تمام افراد کو احساسِ ندامت اور اصل نصب العین کی طرف راغب کرتے ہیں۔ شعور وادراک کے چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں کہ جس میں وہ عقل و سوچ کی وسعتوں تک کیسے رسائی حاصل کرتے ہیں:

لیتے ہیں مجھ سے آئینے تربیتِ سلوک
میں بوریا نشین ہوں، میں خاکسار ہوں (۴۴)

کس کے مخبر ہیں عناصر، پسِ افلاک ہے کون
بھید یہ کھول دے، ایسا مرا ادراک ہے کون (۴۵)

تُو ہی دنیا کو سمجھ پروردۂ دنیا ہے تُو
میں یوں ہی اچھا ہوں سب سے بے خبر رکھا ہوا (۴۶)

بس اک دیے کے سوا گھر میں کچھ نہ تھا احمدؔ
اُسے بھی سامنے ہم خود ہوا کے لے آئے (۴۷)

شعور وادراک اور سوجھ بوجھ کی پرتوں کو چاک کرنے کا ہنر شاعر خوب جانتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میرا تربیتِ سلوک تمام افراد کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ اگر یہ لوگ عقل و شعور رکھتے ہیں تو میری عاجزی اور خاکساری جلد ان میں سرایت کرے گی۔

شاعر کے ہاں ایسے دیرینہ راستے ہیں کہ جن پر چلنا اور پھر ان رازوں سے آشنا کرانا ایک پیچیدہ کام ہے مگر پھر وہ اپنی عاجزی اور رازوں کو پسِ پشت ڈال کر اپنے آپ کو غافل و بے نیاز قرار دیتے ہیں کہ اگر سماج اور عوام اس شعور سے استفادہ نہیں چاہتے تو پھر اپنے آپ کو سب سے بے خبر اور سب سے جدا سمجھتے ہیں۔ شاعر حوصلہ شکنی کے بعد ایک نیا راستہ تلاش کرتے ہیں اور پھر حوصلہ

سے کام لیتے ہوئے امید کا آخری چراغ لے آتے ہیں تاکہ عوام اس شعور و ادراک کے ذریعے اپنے لیے ایک الگ اور منفرد مقام کا تعین کر سکے۔

احمد حسین مجاہد کا شعور و ادراک اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ ان کے دل میں خلقِ خدا کا عشق رچا بسا ہے۔ وہ اپنی تمام تر توانائیاں اس خلق کے لیے نچھاور کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی فلاح و بہبود کے لیے ہر طرح سے کوشاں ہیں۔ جیسے:

اربابِ اختیا کو طاقت کا زعم تھا
میری مطیع خلقِ خدا عشق سے ہوئی (۴۸)

شاعر جب اپنی تمام قوتیں ان کے لیے قربان کرتا ہے تو ان کے اندر شعور و ادراک کا ایک الاؤ جنم لیتا ہے مگر اس کے برعکس وہ معاشرہ جو غیر متحرک اور عقل و شعور سے دور ہی رہتا ہے تو شاعر کہتا ہے:

کھڑے ہیں دیکھنے سورج کی آخری کرنیں
عذابِ دید کے مشتاق صف بہ صف سائیں (۴۹)
دنیا جیسی شے تھی میری ٹھوکر میں
بیناؤں سے میں نابینا اچھا تھا (۵۰)

احمد حسین مجاہد کی شاعری اس طرف متوجہ کرتی ہے کہ جہاں وہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل کو بے تکلفی سے بیان کرتے ہیں وہاں ساتھ ساتھ ان تمام مسائل کے ساتھ عملی طور پر شعور و ادراک کے ذریعے نمٹتے نظر آتے ہیں۔ مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ راستوں اور چٹانوں کو کاٹ کر اس خلا سے نجات حاصل کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل ذیل شعر سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

اَنا کی سخت چٹانوں میں راستہ کر کے
کیا ہے اِک خلا ختم، دوسرا کر کے (۵۱)

سماج کے افراد جب بغیر سوچے سمجھے اور عقل و فہم کا استعمال نہ کرتے ہوئے زوال کا شکار ہو جاتے ہیں تو تب وہ رات کے ساتھ ساتھ دن کو بھی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ یہ افراد کبھی عروج کو پہنچ ہی نہیں سکتے اور اپنے اصل نصب العین سے دور ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے احمد حسین مجاہد کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

ایک ہم ہی نہیں محوِ سفر اس سمت میں
سب کی منزل شہر شب ہے قافلہ کوئی بھی ہو (۵۲)

احمد حسین مجاہد میر کارواں بن کر اپنے آپ کو پیش کر رہے ہیں۔ اپنی بات اور تاثرات کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ وہ ہر طرح کے مصائب اور غم و الم کے باوجود محبتیں بانٹتے نظر آتے ہیں۔ اپنے اس بیان کو اس قدر عام فہم اور سادہ اور سلیس سلیقے سے برت کر سماج کے ساتھ ساتھ دوسرے ممالک کے مسائل کو بھی ادراک کے ذریعے رقم کرتے ہیں۔ ہر طرح کی ناممکن کوشش کے باوجود بھی ان کا اندازِ فکر رجائی ہے اور عوام کے اندر شعور و ادراک کے عناصر کی تشکیل کے لیے ہر چند کوشش میں محوِ عمل ہیں۔ قوم کی فلاح و بہبود اور مثبت طرزِ معاشرت کے لیے وہ کہتے ہیں:

پیروں سے بھنور لپٹ گئے تھے
دریا میں چراغ جل اٹھے تھے
اِک حرف نہ آسماں سے اترا
ہم تھے کہ کتاب مانگتے تھے (۵۳)

آخر کار شاعر شعور ادراک کے متعلق بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے:

موضوعِ گفتگو تھا مرا گھر ہر اک جگہ
میں گھوم پھر کے اپنے ٹھکانے پہ آ گیا (۵۴)

احمد حسین مجاہد ہر اک حربہ استعمال کرنے کے بعد جب جانچتا ہے کہ یہ سماج کبھی انقلاب و تبدیلی نہیں لانے والا اور ان کا شعور اور ادراک کبھی خلا نہیں بخش سکتا تو پھر:

خود رو ہے مجھ میں اپنے مفادات سے گریز
دریا سے عشق اس کے مضافات سے گریز (۵۵)

احمد حسین مجاہد اس امر کے لیے اپنے آپ کو عملی طور پر فنا کر رہے ہیں۔ چوں کہ انسان جب کسی کام کے لیے خود کو نثار کر دے تو یقیناً انسان اپنے آپ کو اور مخلوقِ خدا کے احساسات کو شعوری طور پر سمجھ سکتا ہے۔ احمد بھی ایک ایسا شاعر ہے کہ جس نے اپنے آپ کو فنا کر کے خدمتِ خلق کو اپنا بنیادی مقصد بنایا۔ تو اس لیے شاعر کیا خوب لکھتا ہے:

تب کہیں اپنا آپ پہچانا
خود کو احمد کیا ہے رد برسوں (۵۶)

شاعر کا یہ ایسا شعوری عمل ہے جو ہر کس و ناکس کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ شعور و ادراک رکھنے والا طبقہ مثبت اور سرگرمِ عمل نظر آتا ہے اور یہ طبقہ از خود مسائل کے حل کے لیے شاعر کے کلام سے استفادہ کرتا ہے اور ان کے حل کے لیے نئی راہوں کا متلاشی ہے۔

دوسری طرف شاعر اس عقل مند و دانا طبقے سے دلی محبت والفت رکھتے ہیں جب کہ بے وقوف اور کم عقل افراد سے دوستی رکھتے ہیں تاکہ یہ افراد بھی ان کے قافلے میں شامل ہو کر راہِ راست پر آجائیں اور زندگی اور سماج کی کھوئی ہوئی اقدار کو دوبارہ سے پالیں۔ اسی وجہ سے احمد حسین مجاہد کا شعر اس کی بہترین نمائندگی کرتا ہے:

دھند کے اس پار کیا ہے اب بتا سکتا ہوں میں
زندگی گزری ہے میری ذات کے ادراک میں (۵۷)

احمد حسین مجاہد کی زندگی دراصل سماج کے لیے مثبت سوچ و فکر کے ساتھ ساتھ شعور وادراک کی محور رہے۔ زمانے کے حالات اور ان کی ٹھوکروں نے انھیں جینا سکھادیا ہے اور اب ان کا یہ منشور ہے کہ معاشرے کے باقی افراد بغیر گرنے کے ترقی کی منازل طے کرتے جائیں اور اپنی زندگی کو شعوری طور پر گزار کر جینے کے اصل مقصد کو پہچان سکیں۔

۲.۶ جمالیات

یونانی لفظAesthetics کا اُردو ترجمہ "جمالیات" کہلاتا ہے۔ یونان میں اس لفظ کو "Aisthetickos" کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، جس کے معنی ایسی شے کے ہیں جس کا ادراک حواس کے ذریعے کیا جائے۔ اگرچہ جمالیات فلسفہ کی ایک شاخ ہے مگر ادبی اصطلاح میں مستعمل ہے۔

انسان جمال دوست اور جمال پسند ہے اور حسن کا پرستار ہے جس بنا پر اس نے مظاہرِ فطرت پر جمی گرد کو ہٹا کر خوب سے خوب تر کو اجاگر کرنے کی سعی کی۔ اس امر میں افلاطون کا نام سرِفہرست ہے جنھوں نے دنیا کا حسن ازلی و ابدی اور اس کا محور انسان کو گردانا ہے۔ کسی بھی تخلیق کار کا حسن شعوری یالاشعوری طور پر دنیاوی حسن کی نقل ہے۔

جمالیات دراصل ایک کثیر المعانی اصطلاح ہے۔ اس کی تہیں اور جہتیں ہیں۔ ان عناصر کو کھولنے اور روشنی ڈالنے کا کام کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ مختلف ادوار میں مختلف اساتذہ فن نے جمالیات کی تعریف و تشریح اور توضیح کے لیے خامہ فرسائی کی ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمان "ادب اور

جمالیات" میں اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"یہ اصطلاح کثیر الجہات صورت میں مظاہر قدرت ہے اور سمٹی
ہوئی حالت میں خدائے واحد کے مترادف ہے، جس کی تعریف،
توضیح اور تشریح جتنی بھی کی جائے کم ہے۔"(۵۸)

ادب اور فنون لطیفہ اصل میں جمالیات کی ہی دین ہیں جس کے ذریعے فن کار اور ادیب کی بصیرت میں کشادگی جنم لیتی ہے۔ حسن کے احساس کے ذریعے ہی فن کار کے فن میں پختگی اور نکھار آتا ہے۔اس لیے وہ حسن کا متلاشی ہوتا ہے۔ جو بھی مظاہر فطرت پر جمی ہوئی گرد ہٹا کر خوب صورت مجسمے تراشتا ہے تو کبھی خیال کو لفظوں کا جامہ پہنا کر خوب صورت شکلیں بناتا ہے۔ بات جب لفظی بازی گری کی، کی جائے تو غزل کے اشعار میں یہ تاثر دوسری تمام اصناف سے عیاں نظر آتا ہے۔

غزل کا حسن تغزل، سوزوگداز، ترس وغنائیت، رمزیت و ایمائیت، امیجری و پیکر تراشی اور سراپا نگاری جیسے عناصر میں جمالیات کا اہم حصہ ہیں۔ احمد حسین مجاہد کے کلام میں بھی ہمیں جمالیات کے آثار جابجا نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جھولتی شاخوں کے پتے اور ان کی گنگناہٹ کا ترنم، مظاہرِ فطرت ولہلہاتے سرسبز و شاداب چٹکتی کلیوں اور سائیں سائیں کرتے صحراؤں کی نغمگی محسوس ہوتی ہے۔ ان تمام پہلوؤں سے وہ کام لیتے ہوئے اس قدر حسن کشید کرتے ہیں کہ قارئین پر ایک تاثر قائم کر لیتے ہیں جو تاثراتی جمالیات کا حصہ ہیں۔ احمد حسین مجاہد کے جمالیات پر مشتمل چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

تجھ حسن سے معاملہ کس آن میں ہوا
میں تو جواں ہی میر کے دیوان میں ہوا (۵۹)

سانسوں کی تاریک گزر گاہوں سے آگے
اس نے مجھ میں اپنا دیا جلا رکھا تھا (٦٠)

وہ اُس کے عارض و لب، وہ خرامِ ناز اس کا
گلاب کھلتے ہوئے، کھیت لہلہاتے ہوئے

یوں ہی نہیں یہ پرندے فضا میں ٹھہرے ہوئے
کسی کو دیکھ لیا ہو گا مسکراتے ہوئے (٦١)

اتارتا ہوں میں تصویر اُس کی لفظوں میں
مجھے خیال کا چہرہ دکھائی دیتا ہے

برہنہ پیڑ کی شاخوں پہ چاند اترا ہے
مجھے یہ وقت دعا کا دکھائی دیتا ہے (٦٢)

مندرجہ بالا اشعار کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ احمد حسین مجاہد کا کلام جمالیاتی سطح پر انسان کو حیرانی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ان کی غزل اور نظم دونوں میں تمام تر موضوعات کو وہ جمالیاتی رنگ میں رنگتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جمالیات کا گہرا عمل دخل ہے جس پر وہ فنی تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے خوب صورت لہجے کی نقرئی کھنک اور جمیل ارادوں کی آمیزش سے فکری بصارتوں سے آشنا کراتے ہیں۔ تاثراتی جمالیات کے ساتھ ساتھ احمد حسین مجاہد تحیر کی جمالیات سے بھی بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔ اس حوالے سے احمد عطاء اللہ یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

"ان کا بیانیہ جمالیاتی سطح پر حیران تو کرتا ہے لیکن بیانیہ اجنبیت سے پریشان نہیں کرتا۔۔۔ احمد حسین مجاہد کے ہاں معصومانہ اور بچگانہ تحیر تو دیکھنے کو نہیں ملتا۔ ان کا تحیر فکری سطح پر اس قبیل کا تحیر ہے جس نے اپنے ارد گرد تخلیق کو دیکھ کر اس کے تخلیق کار تک

پہنچنے کی لپک یا جستجو کی ہوتی ہے۔"(٦٣)

احمد حسین مجاہد کے تحیر کی جمالیات کے متعلق اشعار دیکھیے:

بابِ حیرت مستقل وا ہے الجھتی فکر پر
آگہی کی زد میں ہے صبح و مسا، کوئی بھی ہو (٦٤)

یہ میں تھا حیرت کے مرحلوں سے گزر کے میں نے
اس کی تخلیق ہو کے اس کا کمال دیکھا (٦٥)

ہونے لگے ہیں گردِ تحیر میں گم نجوم
اک مشتِ خاک معرکۂ جستجو میں ہے (٦٦)

مندرجہ بالا اشعار احمد حسین مجاہد کے تحیراتی جمال کی عمدہ مثال ہیں جس میں انھوں نے خالق، مخلوق اور تخلیق کے تعلق کو بیان کیا ہے۔ اس تعلق میں جمالیاتی عناصر کارفرما ہیں جن کی انتہائی صورت میں تحیر جنم لے رہا ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار اشعار ایسے ہیں جن میں ہر طرح کے حسن و جمال کو شاعر نے رواداری سے مزین کر دیا ہے۔ جیسے:

ہو سکے تو گنگنا مجھ کو کبھی تو
تیرے لہجے میں بلا کی تازگی ہے (٦٧)

احمد مجھ سے خائف ہے ہر سانپ اب تک
اک دن ماں نے میرا ماتھا چوما تھا (٦٨)

یہ اور بات کہ میں حد سے بڑھ گیا ورنہ
پگھلتی برف سے کس کو نہیں شغف سائیں (٦٩)

مندرجہ بالا تمام مثالیں اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ احمد حسین مجاہد نے اپنے کلام کو جس خوب صورتی و شگفتگی سے پیش کیا ہے، عصرِ حاضر میں کم ہی کسی دوسرے شاعر نے اس طرح تازگی

اور نازک خیالی سے کام لیا ہو۔ احمد حسین مجاہد بیان کرنے کا انداز خوب جانتے ہیں ، جہاں اثرات مرتب کرنے ہوں یا حیرت کی بات ہو تو وہ بالکل موقع محل کے مطابق الفاظ کے ذریعے کر دکھاتے ہیں۔ یہی بات ہے کہ مطالعہ کرتے وقت جہاں انسان پر ایک اثر قائم ہوتا ہے وہاں ساتھ ساتھ انسان حیرت کی دنیا میں بھی کھو جاتا ہے۔ مظاہرِ فطرت کی زیبائش، رنگینیاں اور خوب صورتیاں جس سلیقے سے شاعر جمالیاتی انداز میں پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں اسی کے پیشِ نظر قارئین کے دل و دماغ پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

۲.۷ سماجی شعور / سماجی مسائل

اُردو ادب میں بیش تر شعرا و ادبا نے اپنے ذاتی استغنا کے ساتھ ساتھ اپنے ارد گرد کے حالات و واقعات کا اثر بھی قبول کیا۔ جہاں مؤرخ نے ملک و سماج کی تاریخ کو رقم کیا۔ بالکل اسی طرح لکھاریوں نے بھی ہر طرح کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی مسائل کو لکھا۔

عصری شعور چوں کہ سارے زمانے کے غم والم کو عالمی سطح پر بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، جس میں تخلیق کار ادراک سے کام لیتے ہوئے ایک بہترین پیرایہ اختیار کرتا ہے کہ وہ تمام حالات سے باخبر رہتے ہوئے ان مسائل کی نشان دہی کرتا ہے۔

سماجی شعور وہ عقل و فہم ہے کہ جس سماج و معاشرے میں خود شاعر جی رہا ہوتا ہے تو وہاں کے حالات اور واقعات کو نہ صرف دقیق نظری سے دیکھتا ہے بلکہ وہاں پیش آنے والے مسائل کو ختم کرنے کے لیے بھی مثبت اقدامات کر رہا ہوتا ہے۔ اس سماج میں وہ اپنی تحریروں کے ذریعے ان کے اندر شعور کی نئی راہوں کے متلاشی ہوتا ہے۔ شاعری بھی نثر کی طرح وسعتوں کی حامل ہے۔ دورِ جدید میں تو شعرا نے اپنی شاعری میں ہر طرح کے موضوعات کو پیش کیا۔ جہاں جاگیر دارانہ

نظام، سماجی استحصال اور غربت و افلاس جیسے مسائل کی نشان دہی کی اور ان مسائل پر قابو پانے کے لیے عملی جدوجہد کی۔

جدید دور کے ان شعرا میں ایک اہم نام احمد حسین مجاہد کا بھی ہے جن کی شاعری ہر طرح کے موضوعات سے مزین ہے، جس میں ایک اہم موضوع سماجی شعور اور سماجی مسائل بھی ہے۔ وہ اپنے لفظوں کے ذریعے ان مسائل کی شعوری طور پر نشان دہی کرتے ہیں، جس میں وہ سب سے پہلی اور بنیادی بات یہ بیان کرتے ہیں کہ جب تک کسی بھی سماج کے لیے دل میں محبت و چاہت نہیں ہو گی اور نفرت، حرص اور بغض و کینہ ہو گا تو وہ معاشرہ کیسے آگے بڑھ سکتا ہے مگر آج کا جدید معاشرہ اس قدر الجھن کا شکار ہے کہ نت نئی ایجادات اور سائنسی ترقی نے ایک قسم کا انتشار پھیلا رکھا ہے۔ محبت بانٹتے ہوئے بھی وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھتے ہیں اور سماج سے کہہ اٹھتے ہیں:

ہم پہ ثابت کر دو تم کوئی غم سے تہی
پھر ہمارے جرم کی چاہے سزا کوئی بھی ہو (٧٠)

باوجود اس کے ہ شاعر کو ہر طرح کی مشکلات اور مصائب پیش آتے ہیں مگر پھر بھی وہ ان مصائب اور تکالیف کو کاٹ کر اور سزا پا کر بھی سماجی مسائل کو حل کرنے کی کوشش میں سرگرمِ عمل ہیں اور کہتے ہیں:

مرے لہجے کی دھیمی آنچ سے
پتھر پگھلتے ہیں
مجھے قدرت نے لفظوں کو
برتنے کا ہنر بھی، بخش رکھا ہے
مگر پھر بھی، میں جب اپنے کسی
جذبے کا اس کے ہر حوالے سے

مکمل طور پر، ابلاغ کرنا چاہتا ہوں

کچھ نہیں کہتا (۷۱)

آج کا جدید معاشرہ ستم ظریفیٔ قدرت کا شکار ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ بجائے محبت بانٹنے کے یہ سماج اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مصنوعی رشتے تلاش کرتا ہے۔ مطلب پورا ہونے پر آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ وقتی محبت اور مطلب کے رشتے جو بنائے جاتے ہیں ان کے درمیان باہمی اختلافات جنم لیتے ہیں۔ شاعر نے انھی مسائل کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا:

مرے لیے ہی نہیں ہیں محبتوں کا الم
ستم ظریفیٔ قدرت کا ہیں شکار سبھی
ہر اک کے زیرِ تصوف ہے دوسرے کا بھرم
ضرورتوں سے بندھے ہیں وفار شعار سبھی (۷۲)

احمد حسین مجاہد کی شاعری ہر حوالے سے معتبر ہے۔ وہ اپنے سماج میں رہ کر ان کو راہِ راست پر لانے کی ہر ناممکن کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ اپنے آپ کو مشکلات میں ڈال کر گہرے سمندر میں تیرتے ہیں۔ کنویں میں کود پڑتے ہیں مگر ہار نہیں مانتے۔ جیسے:

میں زندگی کے گہرے سمندر میں تیر کر
اندھے کنویں کے تنگ دہانے پہ آگیا (۷۳)

روز آرزو کوئی میرے دل میں مرتی ہے
تو نہیں سمجھ سکتا مجھ پہ کیا گزرتی ہے
حال پوچھنے والے اب میں کیا کہوں تجھ سے
سانس لے رہا ہوں میں، زندگی گزرتی ہے (۷۴)

احمد حسین مجاہد اپنے ضمیر کے ایک ایک لفظ کو اس سماج کے لیے قربان کر رہے ہیں۔ یہ

الفاظ اس قدر گہرے اور وسعتوں والے ہیں کہ خود شاعر کی دسترس سے بھی باہر ہیں۔ وہ ہر طرح کے استحصال سے نجات اور آزادی حاصل کرنے کے لیے اپنی آواز بلند کرتے ہیں اور سماج کے اندر شعور اجاگر کر کے ان کی اصلاح کرنے کے قائل ہیں۔ وہ معاشی و معاشرتی سلوٹوں کے خاتمے کے لیے قلم اٹھاتے ہیں اور ان مسائل کی روک تھام کے لیے ایک جذبے کے تحت نمودار ہوتے ہیں اور پھر اس کا ادراک کرتے ہوئے کہتے ہیں:

گناہوں کے تقدس کی وکالت کر تو لی لیکن

مجھے احساس ہے اس کا جو بازی میں نے ہاری ہے (۷۵)

شاعر سماجی شعور و مسائل سے آشنا و واقفیت کراتے ہوئے اس بات کا بھی احساس رکھتا ہے کہ یہ وقتی باتیں اور لفظ کسی کام کے نہیں۔ وہ اس کائنات کے لیے ایک بوجھ ہیں اور سماج بھی ان پر ظلم و تشدد کر رہا ہے۔ چوں کہ انسانیت کی قدر باقی نہیں رہی اور جو میرِ کارواں بنتا ہے تو اس پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ دیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ:

میں دکھ میں تھا کائنات کا، جب حد سے بڑھ گیا

میرا ظہور صورتِ انسان میں ہوا (۷۶)

احمد حسین مجاہد سماج کے مسائل پر قابو پانے کے لیے جو لائحہ عمل میں لاتے ہیں وہ عمل شعوری طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ سماج کے دکھ درد کو بہتر طریقے سے سمجھتے ہیں۔ مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود بھی آگے بڑھتے جاتے ہیں اور معاشرے کے لیے ایسی راہوں کا تعین کرتے ہیں جو اس کی ترقی کے لیے اہمیت کی حامل ہیں۔ کوئی ہمدرد و سہارا نہیں ان کا، کوئی رفیق و رازداں نہیں کہ ان کے حوصلے بڑھائے۔ اس لیے شاعر کہتا ہے:

کوئی رفیق! کوئی رازداں!! کوئی ہمدرد!!
مگر یہ خلقِ خدا کس کام آئی ہے
بس اک خدا ہی مرا چارہ ساز ہے ہے لیکن
خدا سے کیسے کہوں، بات ہی کچھ ایسی ہے (۷۷)

شاعر کے کلام میں سماجی شعور کی فراوانی ہے۔ ان کے حوصلے بلند اور مستحکم ہیں۔ ہر ناکام کوشش کے باوجود بھی سماجی استحصال سے آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس آزادی کے لیے شاعر اپنے جسم و جان اور سر کی بازی لگاتے ہیں۔ اس بازی کا آغاز وہ سب سے پہلے اپنے ہی گھر اور ہمسائے سے کرتے ہیں اور بے خوف و خطر کہتے ہیں:

دل ہے تو عشق کے بازار میں کام آئے گا
ورنہ ہمسائے کی دیوار میں کام آئے گا
میں وہ بزدل ہوں، جو ظالم کی حمایت میں اٹھا
اب مرا سر کسی مینار میں کام آئے گا (۷۸)

اسی غم و الم میں ڈوب کر شاعر لکھتے ہیں:

نمازِ عصر پڑھی تھی مکاں کے ملبے پر
تلاوتِ غمِ انساں میں دن گزارا تھا (۷۹)
پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے تھے
سو دب گیا کہیں ملبے میں حوصلہ میرا (۸۰)

اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ احمد حسین مجاہد نے عصری شعور کے ساتھ ساتھ سماجی شعور کو بھی اپنا موضوعِ کلام بنایا ہے۔ سماجی شعور کے ذریعے معاشرے میں پیدا ہونے والے مسائل اور استحصال سے آزادی اور نجات حاصل کرنے کے لیے معاشرے کے ہر فرد کو آگاہ کرتے ہیں کہ یہ

مسائل وقتاً فوقتاً قابو میں لائے جائیں اور خوش حال و پُر امن سماج کی ساکھ ایک بار پھر سے بحال ہو سکے۔

۲.۸ طبقاتی کش مکش

کائنات میں دو طرح کے طبقے آباد ہیں۔ ایک طبقہ غریب و نادار ہے جب کہ دوسرا زوردار اور دولت مند طبقہ ہے۔ ان دونوں طبقوں کے درمیان ایک تصادم اور آویزش جاری ہے جس کو ادبی اصطلاح میں طبقاتی کش مکش Class Struggel کہا جاتا ہے۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی طبقاتی کش مکش کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

> "دنیا میں نادار اور زوردار طبقوں کے درمیان تصادم مفادات کے باعث جو آویزش جاری ہے اسے اشتراکی مصنفین کی اصطلاح میں طبقاتی کش مکش کہا جاتا ہے۔"(۸۱)

ان طبقات میں جو نادار اور غریب طبقہ ہے اسے پرولتاری یا پرولتاریہ بھی کہا جاتا ہے جب کہ زوردار یا دولت مند طبقے کو بورژوا کا نام دیا جاتا ہے۔ ان طبقات میں عدمِ مساوات، سیاسی کش مکش، معاشی استحصال اور نظریاتی آویزش ہے جس کو طبقاتی کش مکش کا نام دیا جاتا ہے۔

کارل مارکس نے ایک اشتراکی نظام کے تحت ان طبقوں کو بورژوا اور پرولتاریہ کا نام دیا ہے، بورژوا وہ طبقہ ہے جس میں وہ استحصال کرنے کے ساتھ ساتھ سرمایہ دار اور ذرائع پیداوار پر مکمل طور پر قابض ہے۔ پرولتاریہ طبقہ جو محنت کش اور مزدور ہے اس طبقے کی تمام محنت بورژوا کے ہاں فروخت ہوتی ہے۔ اس طرح محنت ایک طبقہ کر رہا ہے اور صلہ دوسرے کو ملتا ہے۔ اب ان کے درمیان ایک مسلسل تصادم اور آویزش جاری ہے، جس کی بنا پر ان میں مفاہمت ناممکن ہے۔ اس کے حل کے لیے یہ ضروری ہے کہ پرولتاری آمریت کے تحت ایک غیر طبقاتی معاشرہ قائم کیا جائے

تا کہ ان کو برابر حقوق حاصل ہوں اور اسے اپنی محنت کا صلہ ملتا رہے تا کہ تمام وسائل اور ذرائع پیدوار مشترک ملکیت پر مبنی ہوں اور بورژوا طبقہ اس پوزیشن میں نہ ہو کہ کسی دوسرے کے حقوق اور محنت کا استحصال کر سکے۔

بیسویں صدی عیسوی میں انقلابِ روس نے ہر معاشرے میں ایک شعور و ادراک کی نئ روح پھونک دی۔ غریب و نادار طبقہ حرکت میں آیا اور استحصالی نظام کے خلاف بھرپور احتجاج کیا اور اس چنگل سے مکمل آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ شعرا و ادبا نے اس دور کے حالات کو دیکھا، انقلاب و تغیرات کو پرکھا اور قلمی جدوجہد کی۔ اُردو ادب کے ترقی پسند مصنفین و شعرا نے اسے نہ صرف اپنا موضوع بنایا بلکہ ان مسائل کے حل کے لیے نت نئ راہیں متعین کیں۔

احمد حسین مجاہد بھی وہ شاعر ہیں جن کو ہم ترقی پسند شعرا میں شمار کر سکتے ہیں۔ چوں کہ ایشیا کے کچھ ممالک ایسے ہیں جہاں یہ طبقاتی کش مکش آج بھی موجود ہے۔ ارضِ پاک میں بھی کہیں کہیں ایسے طبقات آج بھی ملتے ہیں جن کے درمیان یہ کش مکش جاری ہے۔ اسی لیے احمد نے ان حالات کا بغور جائزہ لیا اور اپنا موضوع بنا دیا۔ طبقاتی کش مکش کے حوالے سے احمد حسین مجاہد کے چند منتخب اشعار ملاحظہ کیجیے جو ان کی ترقی پسندی اور اس طبقاتی کش مکش کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں:

خواہشوں کو ماورائے جسم کرتا ہی نہیں
میں دبا رکھتا ہوں احمد سورجوں کو راکھ میں (۸۲)

جتنے بدن پہ زخم ہیں بھر جائیں دوستو
ہم پر یہ سانحے بھی گزر جائیں دوستو
دیکھیں تو اک حریف نہیں شہر میں کہیں
سوچیں تو اپنے آپ سے ڈر جائیں دوستو (۸۳)

اسی طرح احمد حسین مجاہد نے ایک نظم "انسان" میں بھی اس کش مکش اور استحصالی نظام کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ انسان دنیا کی تمام تر آسائشات پا کر اب آسمان کو پانے کی جستجو میں ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جو اپنی سرمایہ داری پر غرور کرتا ہے اور مفلس و نادار طبقے کے مسائل حل کرنے کے بجائے خلاؤں کی وسعتوں کو پانے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے مقام سے غافل و بے خبر ہے۔ اگر یہ طبقہ چاہے تو (تمام عالمِ انسانیت جو غربت کی چکی میں پِس رہی ہے)، ان وسائل کی منصفانہ تقسیم کر کے اس استحصال کو ختم کر سکتا ہے۔ مگر یہ مقصدِ تخلیقِ کائنات و خلق سے خود کو بہرہ اور گونگا قرار دے کر استحصال کرنے کے درپے ہے۔ اس حوالے سے نظم "انسان" ملاحظہ ہو:

عقدہ کوئی نہیں جسے انساں نہ حل کر لے
انسان تو خلیفۂ پروردگار ہے
ہر شے ہے اس کے زیرِ تصرف زمین کی
یہ ثبت کر چکا ہے ستاروں پہ نقشِ پا
یہ جانتا ہے مقصدِ تخلیقِ کائنات
اسرارِ کائنات بھی اس کی نظر میں ہیں
تسخیر کر رہا ہے خلاؤں کی وسعتیں
چرخِ کہن بھی اس کی کمندوں کی زد میں ہے
غافل نہیں سکوت کے اجلے کلام سے
انسان بے خبر ہے تو اپنے مقام سے (۸۴)

اسی طرح وہ اس سرمایہ داری کے متعلق اور اس کش مکش کو کچھ یوں پیش کرتے ہیں:

رنجشیں ہیں سود، خواہش اصل زر
ضابطے سب طے ہیں کاروبار کے

کارِ دنیا میں لگیں وہ ٹھوکریں
پیچ سارے کھل گئے دستار کے
ختم ہو جائیں گے سارے سلسلے
بیٹھ جائیں گے کہیں تھک ہار کے (۸۵)

شاعر اپنی بالغ نظری و شعور کی وجہ سے اس کش مکش کا پرچار کرتے ہیں۔ بورژوا سماج ہر طرف انتشار اور فساد پھیلا رہا ہے۔ مگر یہ طبقہ ان مسائل کو حل کرنے کے بجائے مزید وسعتیں بڑھا رہا ہے یہاں تک کہ یہ سماج لڑائی کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور ان کے ہاتھ گلوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ جیسے:

کچھ ایسے آسماں مرے شانے پہ آ گیا
اندھے کا پاؤں جیسے خزانے پہ آ گیا
نادیدہ ہاتھ میرے گلے تک پہنچ گئے
ہستی کا بوجھ جب میں اٹھانے پہ آ گیا (۸۶)
سقراط میرے عہد کا سولی پہ چڑھ گیا
مہلک ترین زہر کا پیالہ اچھال کے (۸۷)
نروان پا کے بھی نہ ہوئی جستجو تمام
میں سخت مضطرب ہوں، بہت بے قرار ہوں (۸۸)
سب فقیروں کو نہیں ملتی نظر کی خیرات
ایسے کاموں میں مساوات نہیں بھی ہوتی (۸۹)

مندرجہ بالا اشعار میں شاعر نے عوامی سطح پر ان کے اندر شعور لانے کی کوشش کی ہے۔ جب تک اس سماج میں مثبت رویے اور اقدامات نہیں ہوں گے تب تک یہ معاشرہ ظلم کی چکی میں پستا

رہے گا اور ہر طرف مسائل کے انبار ہوں گے۔ ساتھ ساتھ استحصال اور یہ کش مکش جاری رہے گی۔ احمد حسین مجاہد پر ممکن کوشش کے باوجود اس کش مکش اور آویزش کے خلاف متحرک ہو کر عوام میں ایک قوت و طاقت لاتے ہیں اور ان کے جذبات کو مزید اچھالتے ہوئے حق کی خاطر لڑنے کا راستہ بتاتے ہیں۔ اسی لیے یہ سب کرتے ہوئے شاعر بعض دفعہ خود بھی گھبرا جاتے ہیں اور کہتے ہیں:

بدن سے آتی ہے بوئے گناہِ ناکردہ
اِک آگ سی میرے سینے میں لہلہاتی ہے
مجھے خود اپنے خیالوں سے خوف آتا ہے
خود اپنے ڈر سے مری سانس پھول جاتی ہے
بس ایک بار دھڑکتا ہے بےطرح مرا دِل
اور اس کے بعد مری نبض ڈوب جاتی ہے (۹۰)

الغرض شاعر اس طبقاتی کش مکش سے مکمل چھٹکارہ چاہتے ہیں۔ اپنے آپ کو مشکلات میں ڈال کر بعض اوقات خود سے بھی خوف کھا بیٹھتے ہیں کہ ان طبقات کا مستقبل کیسے سنوارا جائے۔ مگر پھر بھی شاعر حوصلہ سے کام لیتے ہوئے اکیلے تنہا کسی ایسے صحرا میں کھڑا ہے کہ جہاں کوئی دوست و رفیق نہیں۔ تنے تنہا میر کارواں بنے ہوئے ان طبقات کے درمیان باہمی اختلافات و تصادم کو ختم کرنے کی عملی جدوجہد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ احمد حسین مجاہد کا کلام طبقاتی کش مکش جیسے نظام کی نشان دہی کر کے اس کے حل کے لیے ایک مثبت راہ اختیار کیے ہوئے ہے۔

۲.۹ یادِ ماضی

یادِ ماضی پرانی روایات اور ناسٹلجیائی کیفیت سے وابستہ رہنے کا نام ہے۔ حال میں رہتے

ہوئے قصوں اور داستانوں میں کھوئے رہنا اور پھر ان پر نوحہ خوانی کرنا ہی اس کا ایک حصہ ہے۔ گزرے ہوئے لمحات وواقعات کو دل میں بسائے رکھنا اور پھر حال میں ان کو یاد کر کے ان کو بیان کرنا بھی یادِ ماضی کا ایک اہم جزو ہے۔

اس کے علاوہ بھی اکثر اوقات دوست ایک دوسرے سے گلے شکوے کرتے رہتے ہیں اور یہ شکوے و شکایتیں بیش تر ماضی کی یادوں سے وابستہ ہوتی ہیں جو عموماً تلخ اور ناخوش گوار واقعات پر مبنی ہوتی ہیں۔ انھی تمام حالات وواقعات کو یاد کر کے تکلیف محسوس کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں وہ ذہنی سکون کھو دیتے ہیں اور بے امنی کی کیفیت پھیلتی ہے۔

یادِ ماضی کے متعلق ماہرِ نفسیات یہ درس دیتے ہیں کہ اپنے ماضی کے ان تلخ واقعات کو بھول کر حال میں خوش رہنا اور مستقبل کو سنوارنا ہی ایک کامیاب زندگی اور خوش حال معاشرہ کے لیے نہایت ضروری ہے۔ بعض حالات ایسے بھی آتے ہیں کہ حال کی تنگ دامنی سے گزشتہ حالات سے بھی موازنہ کرتے ہیں یا پھر حال کے سنور جانے پر ماضی کی کڑی مشکلات اور مصائب کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ یہ تمام عناصر یادِ ماضی کے زمرے میں آتے ہیں۔

اُردو شاعری میں ایسے کئی موضوعات ہیں جو ہر شاعر نے اپنے کلام میں برتے ہیں مگر ماضی کی حسین یادیں اور ناسٹلجیائی کیفیات بہت کم شعرا کے ہاں دکھائی دیتی ہیں۔ احمد حسین مجاہد بھی ان شعرا کی صف میں کھڑے ہیں جنھوں نے یادِ ماضی کے حسین و جمیل لمحوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ وہ ماضی کی ان تمام یادوں سے اب بھی پیوست ہیں اور حال میں رہتے ہوئے ماضی کے حالات و واقعات میں کھو بیٹھتے ہیں۔ جیسے:

ماضی کی اک لغزش کے آئینے میں
میں نے مستقبل کا چہرہ دیکھا ہے (۹۱)

ذہن میں ابھرتے ہیں خدوخال سے احمدؔ
یاد سی کوئی میرے دل پہ پاؤں دھرتی ہے (۹۲)

اس سال تو احمد مجھے کیا کیا میسر تھا مگر
پچھلے برس کی راکھ سے چہرہ تروتازہ ہوا (۹۳)

مندرجہ بالا اشعار میں شاعر نے ان کیفیات کو بیان کیا ہے جو ان کے ماضی سے جڑی ہیں۔ کبھی حال میں رہ کر ماضی سنوارتے ہیں تو کبھی ماضی میں کھو کر اپنے حال و مستقبل کی خوش حالی کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح چند اشعار جو یادِ ماضی کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ جیسے:

مرے اندر ابھی وہ آدمی زندہ ہے جو احمدؔ
سلگتے سوچتے ویران لمحوں کا شکاری ہے (۹۴)

ذرا غور سے مجھ کو دیکھو!
جہاں میں تمہیں اب نظر آرہا ہوں
وہاں کچھ نہیں، اپنا ماضی ہوں میں
تم نجانے کہاں کھو گئے ہو؟
کہیں تم بھی میری طرح۔۔۔۔۔۔۔(۹۵)

اوڑھ لیتا ہے خدوخال بھی گاہے گاہے
اک تصور مجھے تصویر بنایا جاتا ہے (۹۶)

میں کیا کہوں کہ یہ کیسا شگون ہے احمدؔ
وہ یاد آیا مجھ کو دیا جلاتے ہوئے (۹۷)

احمد حسین مجاہد کی غزل و نظم دونوں میں یادِ ماضی کی جھلکیاں محسوس ہوتی ہیں۔ ان کے اندر

ایک آدمی آج بھی زندہ ہے جو انھیں ماضی کے حسین دریچوں میں لے جاتا ہے اور تادیر تصورات و خیالات میں گم کر دیتا ہے۔ حال میں جیتے ہوئے اپنے ماضی کو یوں بیان کرتے ہیں جیسے وہ ایک بار پھر سے اُسی زمانے میں لوٹ جانا چاہتے ہیں۔ وہ بیٹھے بیٹھے تصور میں آکر ماضی اور اس سے جڑے خدوخال کی تصویر بناتے ہیں۔ کوئی بھی ایسا کام جو بچپن میں انتہائی دل کش اور خوب صورت تھا، مگر حال میں وہ کام کرتے ہوئے انھیں فوراً اپنا ماضی یاد آجاتا ہے۔

اس کے علاوہ وہ لمحات جو دوستوں کے درمیان گزرے اور مختلف مقامات کی سیر و سیاحت کے موقع پر میسر آئے، کو انتہائی دل کش انداز میں رقم کرتے ہیں۔ ان کی مختلف نظمیں اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ وہ یادِ ماضی سے کسی بھی طرح غافل و بے نیاز نہیں۔ ان نظموں میں "اپنے جیسے لوگوں کا دکھ"، "جھیل سیف الملوک" اور "گلیات کی ایک شام" ماضی کی یادوں پر مشتمل ہیں۔ "گلیات کی ایک شام" ملاحظہ ہو:

دھند کے
اس پار بستی کے مکانوں میں
دیئے جلتے ہوئے دیکھے
تو جانے کن نگاہوں سے
کسی نے مجھ کو دیکھا تھا
کہ اب تک
میری ساری زندگی میں دھند پھیلی ہے
دیا اک بھی نہیں جلتا (۹۸)

مندرجہ بالا نظم "گلیات کی ایک شام" میں شاعر نے اپنے ماضی کے ان واقعات کا ذکر کیا ہے کہ جب انسان دنیا سے ماورا ہو کر بغیر کسی دکھ و مصیبت کے اپنی الگ دنیا بساتا ہے تو تب یہ زندگی کی

حسین یادوں میں شمار ہو جاتی ہے۔ پھر وہ چاہے تو جنگلات کی ہریالی دیکھے، سبزوں کی لہلہاہٹ دیکھے یا پھر پرندوں کا فضا میں اڑنا دیکھے۔ مگر عصرِ حاضر میں یہ اب میسر نہیں کہ وہ کارِ جہاں میں اتنا ڈوب چکا ہے کہ انسان کو فرصت ہی نہیں کہ وہ یہ سوچے کہ اس کا اصل نصب العین کیا ہے اور جینے کا اصل مقصد کیا ہے۔

عصرِ حاضر میں پروان چڑھتا ہوا جدید معاشرہ بھی انھی مشکلات سے دوچار ہے۔ اسے خبر نہیں کہ وہ اپنے ماضی میں کیا تھا، حال میں کیا کر رہا ہے اور اس کا مستقبل کتنا تاب ناک ہونے والا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ حال میں رہتے ہوئے انسان ماضی کی حسین یادوں میں کھو جانے کے بجائے اپنے مستقبل کو روشن کرے۔ اسی بات کی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہے کہ اگرچہ وہ حال میں رہ کر مستقبل کے حالات و واقعات کو یاد کرتے ہیں مگر ساتھ ساتھ بہتر اور روشن مستقبل کے لیے بھی مثبت اقدامات کر رہے ہیں۔ اسی حوالے سے ایک ادبی جریدے "جدید ادب" میں چند تاثرات میں خالد خواجہ لکھتے ہیں:

> "بے ساختگی اور خلوصِ جاں احمد حسین مجاہد کی تحریر اور شعرا کے بنیادی عناصر ہیں۔ مجاہد ایک شان دار ادبی ماضی رکھتا ہے اور اسی حوالے سے اُس کا مستقبل بھی تاب ناک ہے۔"(۹۹)

احمد حسین مجاہد کے کلام میں دیگر موضوعات کی طرح ان کا ماضی بھی پیوست ہے۔ اس ماضی میں ادبی، علمی اور معلوماتی اعاصر بھی موجود ہیں جو اہمیت کے حامل ہیں۔ فکری سطح پر شاعر کی تحریریں جہاں انسان کو تصوراتی و تخیلاتی دنیا میں لے جا کر ماضی سے جوڑ دیتی ہیں وہاں ساتھ ساتھ یہ تحریریں مقصدیت و اخلاقیات سے بھرپور نظر آتی ہیں۔ اس لیے ہم ان کے یادِ ماضی سے کبھی انکار نہیں کر سکتے بلکہ ان موضوعات میں یہ عنوان بھی سرِ فہرست رہے گا۔

۲.۱۰ سیاسی شعور

احمد حسین مجاہد کی شاعری کا ایک اہم موضوع سیاسی شعور بھی ہے۔ دورِ جدید میں ریاضیاتی تسلسل میں جہاں تشکیل و تخریب ہے وہاں جدید شعرا کے کلام میں اس تسلسل کو روکنے اور اس تغیراتی عمل کو کئی زاویوں سے دیکھنے کا بھی ایک جذبہ موجود ہے۔ ان شعرا کے ہاں عالمی سطح پر سماج کے خدوخال، وقت کا انقلاب و تغیر اور پامال ہوتی اقدار کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان تمام پہلوؤں میں ایک نمایاں پہلو سیاسی شعور بھی موجود ہے۔

احمد حسین مجاہد بھی اس وقت کے تغیر و تبدل کو کئی زاویوں سے دیکھتے ہیں۔ معاشرے کے ایک ایک فرد کے خدوخال، اقتصادی مسائل، غیر منصفانہ تقسیم اور تہذیب و طبقات کی کش مکش جیسے موضوعات کو زیرِ بحث لایا۔ اسی سلسلے میں ان کا سیاسی شعور ایک خاص حوالے سے منظرِ عام پر آتا ہے جس میں وہ قدیم اقدار و روایات سے استفادہ کرتے ہوئے آج کے جدید معاشرے میں سیاسی سطح پر شعور اجاگر کرتے ہیں۔ بیک وقت ان کے کلام میں مختلف النوع تصورات جھلکتے ہیں۔ سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کے ساتھ ساتھ تصورِ وقت، تصورِ دین اور تصورِ انسان جیسے موضوعات یک جا ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے طارق ہاشمی لکھتے ہیں:

> "احمد حسین مجاہد کے اشعار میں اس کا تصورِ وقت، تصورِ دین اور تصورِ انسان یک جا ہو جاتے ہیں اور وہ کرۂ ارض پر آباد انسانوں کو وقت کے اُس وسیع اور تلخ تناظر میں دیکھتے ہیں جسے فراموش کر کے وہ ہر طرح کے ظلم کو بھی فروغ دیتے ہیں اور اپنے انجام سے بھی بے خبری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔"(۱۰۰)

احمد حسین مجاہد کی شاعری میں عصری شعور ہی وہ فکری جہت ہے کہ جس میں سماج کے

سیاسی پہلو کو نمایاں کرتے ہیں۔ اس پہلو کو فکرِ انقلاب سے ملاتے ہیں کہ قوموں کی ترقی ان کے شعور اور انقلاب کی وجہ سے ہی ممکن ہے۔ ورنہ یہ محض ایک خواب ہے اور جس کا کوئی حل نہیں۔ جیسے:

آتا ہے ان سے فکر کی دنیا میں انقلاب
سینے میں گھٹ کے خواب جو مر جائیں دوستو (۱۰۱)

عہدِ حاضر میں جس قدر سیاسی مسائل جنم لیتے ہیں بالکل ایسی طرح شاعر نے بھی اس کی خوب عکاسی کی ہے کہ انسان نے کرسی حاصل کرنے اور اقتدار میں آنے کے لیے ہر طرح کی کوششیں کی ہیں۔ عوام سے وعدے کر کے ان سے جھوٹ بول کر جس طرح وہ سامنے آتے ہیں تو ان کو شاعر کچھ یوں بیان کرتا ہے:

اک ذرا آسمان چھونے کو
اُس نے اونچا کیا ہے قد برسوں (۱۰۲)

سیاسی شعور کے حوالے سے چند منتخب اشعار ملاحظہ کیجیے:

سوچے جو وہ تو اس کی سخاوت پہ طنز ہے
کاسہ بدست شخص کا خیرات سے گریز (۱۰۳)

ورنہ میں کس شمار میں ورنہ میں کس قطار میں
میں بھی ہوں صاحبِ نظر قحطِ کمال کے نثار (۱۰۴)

جھاڑ تا تھا میں آستیں اپنی
ڈھونڈ تا تھا میں کونوں کھدروں میں
سانپ جوتے میں چُھپ کے بیٹھا تھا (۱۰۵)

احمد حسین مجاہد نے سیاسی شعور بیدار کر کے سماج کو اس بات کی توجہ دلائی ہے کہ آج کے حکومتی نمائندے محض مطلب پرست اور دھوکے باز ہیں۔ عوام کو جھوٹے جال میں پھنسا کر چند

ٹکوں کے عوض اپنا بناتے ہیں۔ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ کچھ لینا ہے تو ہم سے لیں دوسروں کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں۔ یہ معصوم اور سادہ لوح عوام ان نمائندوں کی باتوں میں آکر اپنی عزت و افلاس کی بدولت کاسہ ہاتھ میں لیے ان کے سامنے جاتے ہیں۔ وقت طور پر تو ان کی ضروریات کسی حد تک پوری کرتے ہیں مگر یہ ایسی خیرات ہے کہ جو چند ہی دنوں تک بر قرار رہتی ہے۔ اس کے بعد یہ عوام پھر اپنی اسی اصل حالت میں آجاتی ہے۔

شاعر نے اسی کش مکش کو اپنی شاعری میں سمو دیا ہے اور عوام کو یہ شعور عطا کر رہے ہیں کہ ان نمائندوں کی حالت سانپ جیسی ہے جو آستینوں میں چھپ کر بیٹھے ہیں۔ کمر پیچھے ان کے رویے اور تعصبانہ جارحیت ان سادہ لوح انسانوں کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔ اسی طرح احمد حسین مجاہد مزید سماج سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

زباں سمجھتا ہوں میں ٹوٹتے ستاروں کی
یہ شہر مجھ کو اجڑتا دکھائی دیتا ہے (۱۰۶)

شاعر نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اہلِ سیاست نے شہر کو مکمل طور پر اُجاڑ دیا ہے۔ اس میں بسنے والے ہر فرد کے مقدر کو وہ سمجھتے ہیں اور پھر عوام کے اندر یہ شعور بیدار کرتے ہیں:

خوش ہوں کہ اپنے حق سے میں ہوتا ہوں دست کش
مجھ سے تُو خوف کھا، میں بڑا ہوشیار ہوں (۱۰۷)

سماج کی فکر کو وہ جذباتی انداز میں پیش کرتے ہیں اور اس طرف متوجہ کرتے ہیں کہ یہ حکومتی نمائندے بڑے چالاک اور ہوشیار ہیں۔ اسی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے وہ اقتدار میں آجاتے ہیں اور عوام کی بے شعوری سے یہ آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ مگر کیے ہوئے وعدے وہ بھول جاتے ہیں۔ معاشرے کے لوگ بس دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور جگہ پر لکھتے ہیں:

اُس کو طرح ملی مرے فکر و شعور سے
جو فیصلہ بھی وقت کے ایوان میں ہوا (۱۰۸)

اسی طرح احمد حسین مجاہد سماج کو سیاسی شعور کا درس دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ اب سماج کو چاہیے کہ وہ مزید اس استحصال سے نجات حاصل کریں اور اپنے اندر شعور کی ایک نئی راہ کا تعین کریں۔ اپنے خوابوں کو یہ شہر پورا کر لے اور تاریکی سے نکل کر اجالوں میں آجائے۔ جیسے:

دیکھے گا میرے دیکھے ہوئے خواب سارا شہر
کس کس کے غم کو میں نے اُجالا نہیں دیا (۱۰۹)

شاعر کا یہ جان دار اور زندہ موضوع ہے جس کے تحت وہ سماج کو عملی طور پر متحرک کرتے ہیں۔ اسی لیے یہ موضوع کسی ایک فرد یا سماج کے لیے نہیں ہے بلکہ عالمی سطح پر بھی وہ اس کوشش میں ہیں کہ ہر معاشرہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی استحصال کا شکار نہ ہو۔ جس سوچ و فکر میں شاعر خود ہے سماج بھی اسی فکر کا حصہ بنتے ہیں اور اپنے غم کا ادراک کرتے ہوئے اجالوں کے متلاشی ہیں۔ تبھی تو وہ کہتے ہیں:

فلک بھی شاید کسی کی باتوں میں آ گیا ہے
مرا مقدر جبیں سے ہاتھوں میں آ گیا ہے
یہ تیرے غم کے بیاں کی ساعت ہے جانِ احمدؔ
بدن سے کھینچ کر لہو دواتوں میں آ گیا ہے (۱۱۰)

سیاسی شعور اوادراک شاعر کے قلم سے ٹپکتا ہوا خون کا ایک ایک قطرہ ہے جو صفحۂ قرطاس پر سدا مرتسم ہو گیا ہے۔ وہ سماج کا مقدر بدل کر اسے قدر و منزلت عطا کرتے ہیں۔ انھیں وہ آسمان کی رفعتیں اور وسعتیں فراہم کرتے ہیں تاکہ معاشرے میں پسا ہوا طبقہ اپنے حق کے لیے نکل کر

سامنے آئے اور استحصال سے مکمل آزادی حاصل کر لے۔ اسی بنا پر احمد حسین مجاہد سماج کا غم اپنا ذاتی غم سمجھ کر لکھتے ہیں اور ان سیاسی افراد کو مخاطب ہو کر لکھتے ہیں:

اک دیا ہے پسِ چشم فروزاں ہے کہیں
یہ دیا کل تری سرکار میں کام آئے گا (۱۱۱)

بعض اوقات شاعر کا یہ سیاسی شعور سماج پر کچھ تاثرات قائم کرنے کے بجائے سماج پر وقتی اثر دکھاتا ہے۔ سماج بنیادی طور پر شاعر کا ساتھ دیتا ہے مگر جوں ہی کوئی بااختیار فرد ان کے سامنے آتا ہے تو اس معاشرے کا پھر یہ مؤقف ہوتا ہے:

مجھ سے لپٹا تو مری پشت سے احمد اس نے
میرے دشمن کی طرف ہاتھ بڑھایا ہوا تھا (۱۱۲)

دعویٰ ہے جسے احمد وہ اپنی اکڑ لے کر
دنیا کے کناروں سے اک بار نکل دیکھے (۱۱۳)

جسے کر نہ پائے سورج وہی کام ہو دِیئے سے
اے مرے خرد زدہ دل یہ مقام فکر کا ہے (۱۱۴)

مدت گزر گئی ہے اس حال میں کہ میرے
اک ہاتھ میں دِیا ہے اک ہاتھ ہے دیئے پر (۱۱۵)

احمد حسین مجاہد کا یہ دل کش علامتی انداز پسے ہوئے طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ علامتوں کے ذریعے وہ اس بات کو پیش کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو اپنے اقتدارِ اعلیٰ ہونے پر دعویٰ ہو پھر انھیں چاہیے کہ وہ اپنی دنیا سے باہر نکل کر صرف نچلے طبقے کے ساتھ گزر بسر کر کے دکھا دیں جو ان کے لیے انتہائی مشکل ہے۔ مگر بعض اوقات یہ دعوے جھوٹے پروپیگنڈے پر مبنی ہوتے ہیں اور سماج کا پسا ہوا طبقہ ان نمائندوں کی بغاوت سے محرک ہو کر اپنی مدد آپ کے تحت اپنی حیات اور مستقبل کو

روشن کرتے ہیں۔ لفظ "دِیا" جو ایک بھرپور علامتی اندازِ فکر ہے، جس کے ذریعے شاعر نے پسے ہوئے طبقے کی نمائندگی کی ہے جب کہ لفظ "سورج" بااختیار اور حکومتی نمائندوں کی عکاسی کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ احمد حسین مجاہد کی شاعری جدید فکری رجحانات کی بھرپور عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ ایک مکمل دبستانِ فکر ہے۔ معاشرے میں رونما ہونے والے ہر حالات و واقعات سے بخوبی آگاہ و آشنا ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری متنوع موضوعات کی حامل ہے۔ ان کی نظم اور غزل نہ صرف کسی ایک ملک و معاشرے کے لیے فلاح و بہبود کا پیغام ہے بلکہ عالمی سطح پر بھی ان کی شاعری کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ ان کی شاعری کے مندرجہ بالا چیدہ چیدہ موضوعات جو زیرِ بحث لائے گئے ہیں ان کی روشنی میں مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ احمد حسین مجاہد کی شاعری ایک پائیدار اور مکمل اندازِ فکر پر مبنی ہے۔ وہ معاشرے و سماج میں پیدا ہونے والے مسائل اور استحصال، عصری شعور، شعور و ادراک، سماجی شعور، سیاسی شعور اور اس کے علاوہ ہجر وصال، عشق و محبت، جمالیات اور یادِ ماضی کو اپنا موضوع بنا کر انھیں زندۂ جاوید کر دیا ہے۔

اس کے علاوہ ان کے دیگر موضوعات بھی انتہائی اہمیت کے حامل ہیں، جن میں رومانویت، داخلیت و خارجیت، اخلاقیات، تصوف اور دیگر مذہبی عنوانات کو بھی اپنا موضوعِ کلام بنایا ہے۔ ان کی شاعری محسوسات کی شاعری ہے، تاثراتی و جمالیاتی ہے۔ وہ شاعری کے ذریعے ملک و سماج میں عشق و محبت اور اخلاقیات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کی رہنمائی کرتے نظر آتے ہیں۔ سماج میں تبدیلی اور انقلاب کے امکانات واضح کرنے کے خواب دیکھتے ہیں۔ یہی خواب ان کی آرزوؤں میں منتقل ہو کر بے سہارا، مجبور اور بے اختیار ہو چکا ہے مگر شاعر ان تمام عناصر سے ان کو چھٹکارا دینے کے متمنی ہیں۔ اس حوالے سے جان عالم ایک ادبی جریدہ "جدید ادب" میں شامل

مضمون "احمد حسین مجاہد کی شاعری اور ہمارے خواب" میں یوں گویا ہیں:

انسان کی زندگی میں اس کے پاس اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں کہ وہ خواب دیکھتا ہے۔ آرزوئیں، امیدیں جنم لیتی ہیں اور زندگی آگے بڑھتی ہے۔ آج کے انسان نے جسے محرومی، مجبوری اور بے اختیاری کا نام دے کر اسے شاکی بنا دیا ہے، حقیقت میں خالق کا اپنی مخلوق پر سب سے بڑا احسان ہی یہی ہے۔ ہماری زندگی کا سارا حسن ہمارے خواب ہیں اور احمد حسین مجاہد تو زندگی اور موت کے پیمانے ہی الٹ دیتا ہے جب وہ زندگی کو خواب اور موت کو اس خواب سے بیدار ہونے کا نام دیتا ہے۔"(۱۱٦)

اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جدید شعرا میں احمد حسین مجاہد بھی ہمہ جہت شاعر ہیں، جن کی شاعری متنوع پہلوؤں کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ انھی پہلوؤں کی بدولت ان کا کلام دقیق فکری عناصر سے لبریز ہے۔ سماج ان کی شاعری سے اپنا مستقبل روشن کر کے اپنا مقام و مرتبہ تعین کر سکتا ہے۔

حاصلِ مطالعہ کلام سے راقم بھی اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جدید شعرا میں ہزارہ کے نمائندہ شاعر احمد حسین مجاہد کی شاعری میں ایک سوچ و فکر ہے، جس کے تحت وہ ایک مثالی معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ سماج کی فلاح و بہبود کے لیے ہر ممکنہ کوشش کر کے خود کو مشکلات میں ڈال کر ان کے لیے نئی راہوں کا تعین کرنے کے آرزو مند ہیں۔ جوں جوں وقت بڑھتا جائے گا، احمد حسین مجاہد کی شاعری ادبی حلقوں اور انجمنوں میں اپنی اہمیت و افادیت کے تاثرات قائم کرتی رہے گی۔ ان کے ہم عصر شعرا بھی ان کے کلام سے فیض یاب ہو کر ادب برائے زندگی کے قائل ہوں گے اور ایک پُر امن اور خوش حال معاشرے کی تشکیل و ارتقا میں پیش پیش ہوں گے۔

حوالہ جات

۱۔ گوہر رحمان نوید، صوبہ سرحد میں اُردو ادب (پس منظر و پیش منظر)، یونیورسٹی پبلشرز، قصہ خوانی پشاور، ۲۰۰۰ء، ص۸۰

۲۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص۲۸

۳۔ ایضاً، ص۲۹

۴۔ ایضاً، ص۴۲

۵۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، عکاس پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص۴۵

۶۔ ایضاً، ص۳۲

۷۔ ایضاً، ص۳۰

۸۔ ایضاً، ص۶۵

۹۔ ایضاً، ص۵۶

۱۰۔ ایضاً، ص، ۶۷

۱۱۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص۵۳

۱۲۔ ایضاً، ص۶۱

۱۳۔ ایضاً، ص۶۶

۱۴۔ ایضاً، ص۵۶

۱۵۔ ڈاکٹر ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص۱۲۳

۱۶۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص ۲۷

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۱

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۲

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۲۰۔ ایضاً، ص ۹۷

۲۱۔ ایضاً، ص ۹۴

۲۲۔ ایضاً، ص ۴۷

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۱۳

۲۵۔ ایضاً، ص ۵۴

۲۶۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص ۲۷

۲۷۔ ایضاً، ص ۴۷۔۴۸

۲۸۔ ایضاً، ص ۵۶

۲۹۔ ایضاً، ص ۶۵

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۵۹

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۵۷

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۳۸

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۳۱

۳۴۔ ایضاً، ص ۸۲

۳۵۔ گوہر رحمان نوید، صوبہ سرحد میں اُردو ادب (پس منظر و پیش منظر)، ص۹۷

۳۶۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص۸۹

۳۷۔ ایضاً، ص۴۱

۳۸۔ ایضاً، ص۶۷

۳۹۔ ایضاً، ص۶۰

۴۰۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۲۵۔۲۶

۴۱۔ ایضاً، ص۱۵۸

۴۲۔ ایضاً، ص۵۷

۴۳۔ ایضاً، ص۴۳

۴۴۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص ۳۲

۴۵۔ ایضاً، ص۳۳

۴۵۔ ایضاً، ص۲۹

۴۷۔ ایضاً، ص۳۰

۴۸۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص

۴۹۔ ایضاً، ص۲۸

۵۰۔ ایضاً، ص۳۰

۵۱۔ ایضاً، ص۳۱

۵۲۔ ایضاً، ص۳۵

۵۳۔ ایضاً، ص۳۷

۵۴۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۴۶

۵۵۔ ایضاً، ص۵۷

۵۶۔ ایضاً، ص۱۵۶

۵۷۔ ایضاً، ص۱۵۲

۵۸۔ پروفیسر شکیل ارحمان، اُردو ادب اور جمالیات، مرتب و تدوین، شیخ عقیل، دہلی، ۲۰۱۱ء، ص۶

۵۹۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص۲۸

۶۰۔ ایضاً، ص۹۵

۶۱۔ ایضاً، ص۸۶

۶۲۔ ایضاً، ص۴۳۔۴۴

۶۳۔ احمد عطاء اللہ، انٹرویو، ایبٹ آباد، فروری ۲۰۲۲ء

۶۴۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۳۶

۶۵۔ ایضاً، ص۵۵

۶۶۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص۱۱۶

۶۷۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۱۵۴

۶۸۔ ایضاً، ص۳۰

۶۹۔ ایضاً، ص۲۸

۷۰۔ ایضاً، ص۳۶

۷۱۔ ایضاً، ص۴۱

۷۲۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص ۴۲

۷۳۔ ایضاً، ص۴۶

۷۴۔ ایضاً، ص۵۱

۷۵۔ ایضاً، ص۱۵۰

۷۶۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص۲۸

۷۷۔ ایضاً، ص۴۱

۷۸۔ ایضاً، ص۵۳

۷۹۔ ایضاً، ص۱۰۱

۸۰۔ ایضاً، ص۱۱۵

۸۱۔ ڈاکٹر ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ص۱۶۵

۸۲۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۱۵۳

۸۳۔ ایضاً، ص۱۴۴

۸۴۔ ایضاً، ص۱۰۰

۸۵۔ ایضاً، ص۹۸

۸۶۔ ایضاً، ص۴۵

۸۷۔ ایضاً، ص۳۴

۸۸۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص ۳۲

۸۹۔ ایضاً، ص۱۱۴

۹۰۔ ایضاً، ص۴۲

۹۱۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۲۹

۹۲۔ ایضاً، ص۵۲

۹۳۔ ایضاً، ص۲۷

۹۴۔ ایضاً، ص۱۵۱

۹۵۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص۳۶

۹۶۔ ایضاً، ص۱۱۷

۹۷۔ ایضاً، ص۸۶

۹۷۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۶۰

۹۹۔ حیدر قریشی، جدید ادب، مضمون مشمولہ: خالد خواجہ، شمارہ ۱۲، سرور اکادمی، جرمنی، جنوری تاجون ۲۰۰۹ء، ص۱۱۶

۱۰۰۔ طارق ہاشمی، شعریاتِ خیبر—عصری تناظر، محمد اکرم عاربی، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء، ص۱۷

۱۰۱۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۱۴۵

۱۰۲۔ ایضاً، ص۱۵۶

۱۰۳۔ ایضاً، ص۵۷

۱۰۴۔ ایضاً، ص۴۸

۱۰۵۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص۱۱۱

۱۰۶۔ ایضاً، ص۴۴

۱۰۷۔ ایضاً، ص۳۲

۱۰۸۔ ایضاً، ص۲۸

۱۰۹۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص۲٦

۱۱۰۔ ایضاً، ص۳۴

۱۱۱۔ ایضاً، ص۵۳

۱۱۲۔ ایضاً، ص٦۲

۱۱۳۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص٦۷

۱۱۴۔ ایضاً، ص۹۴

۱۱۵۔ ایضاً، ص۱۰۷

۱۱٦۔ حیدر قریشی، جدید ادب، مضمون مشمولہ: جان عالم، شمارہ ۱۲، ص۱۱۰۔۱۱۱

باب سوم

احمد حسین مجاہد کی شاعری: فنّی مطالعہ

اُردو زبان و ادب میں شاعری اپنے فکری رجحانات کے ساتھ ساتھ فنی محاسن سے بھی بھرپور ہے۔ فکری پہلوؤں کو فن کے قالب میں ڈھال کر پیش کرنا اور پھر ادب میں شاعری کو زندہ جاوید بنانا ہی فن کار کا خاصہ ہوتا ہے۔ خصوصاً غزل میں قافیہ و ردیف کی پابندی اور اوزان و بحروں کے استعمال سے اس کا حسن اور دوبالا ہو جاتا ہے۔ انھی عناصر کی وجہ سے شاعری میں غنائیت و ترنم بھی پیدا ہوتا ہے۔

احمد حسین مجاہد کی شاعری بھی انھی فنی محاسن سے خوب مزیّن ہے۔ ان کی شاعری میں علمِ بیان اور علمِ بدیع کے ساتھ جدت و ندرت اور کلاسیکی رنگ بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ محاورات، منظر نگاری اور فطرت نگاری ان کی شاعری کو مزید چار چاند لگا دیتی ہے۔ یہی وجہ کہ ہے کہ ان کی شاعری نہ صرف متنوع فکری رجحانات کی عکاسی کرتی ہے بلکہ ساتھ ساتھ ان کا کلام نئے فنی محاسن سے بھی بھرپور ہے۔ ان فنی خصوصیات کی وجہ سے پڑھنے والے کو دل چسپی اور تاثیر کے عناصر مہیا ہوتے ہیں۔ انھی فنی خصوصیات کو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

۳.۱ علمِ بیان

علمِ بیان کے لفظی معنی واضح کرنا اور روشن کرنے کے ہیں۔ یہ ادبی تحریر میں نقش و نگار اور بناوٹ و سجاوٹ کے ساتھ ساتھ خوب صورتی اور دل کشی پیدا کرتا ہے۔ علمِ بیان ہی کی بدولت تحریر میں فصاحت و بلاغت کی نمایاں جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ جھلک تحریروں میں جدت و ندرت کے علاوہ مؤثر اور دل نشین ہوتی ہے اور اسلوب میں بھی ندرت و تازگی پائی جاتی ہے۔ علمِ بیان کی تعریف و تشریح کرتے ہوئے ڈاکٹر فاروق چوہدری لکھتے ہیں:

"علمِ بیان کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ایک لفظ کے معنی کو اپنی تحریر و تقریر اور نظم و نثر میں چند ایسے مختلف طریقوں اور مختلف

دلائل سے اس طرح بیان کیا جائے کہ خواہ کئی عبارتوں میں اس
ایک ہی واقعہ کا بیان کریں مگر اس لفظ کا مترادف لفظ استعمال نہ
کریں تاکہ سامعین یا قاری ایک ہی قسم کے الفاظ کی تکرار سے اُکتا
نہ جائیں بلکہ ہر عبارت کو بار بار پڑھیں اور لطف اندوز ہوں۔"(۱)

مندرجہ بالا اقتباس اس بات کو نمایاں کر رہا ہے کہ علمِ بیان وہ علم ہے جس میں مصنف، ادیب اور شاعر الفاظ کی ہیر پھیر اور مختلف پیرائے استعمال کر کے تحریروں اور فن پاروں کو فصیح و بلیغ بناتا ہے۔ ان پیراؤں کی مختلف چار اقسام ہیں، جن میں تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل اور کنایہ شامل ہیں۔ یہی عناصر احمد حسین مجاہد کی شاعری کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ جیسے:

ا۔ تشبیہ

تشبیہ کے لفظی معنی مثال، مشابہت، شبیہ اور تمثیل کے ہیں۔ لغوی اعتبار سے اس سے مراد کسی ایک چیز کو کسی دوسری چیز کے ساتھ کسی صفت میں مشابہ کرنا تشبیہ ہے۔ تشبیہ کے متعلق ڈاکٹر اشفاق احمد ورک یوں رقم طراز ہیں:

"جب کسی چیز کو کسی مشترک صفت یا صفات کی بنا پر نیز اس کی
کیفیت اور صورتِ حال کو مزید پُر تاثیر اور کیف آور بنانے کے
لیے کسی دوسری چیز کی مانند قرار دیا جاتا ہے تو اسے علمِ بیان کی
اصطلاح میں تشبیہ کہتے ہیں۔"(۲)

نظم و نثر میں تشبیہ کا عنصر اس طرح شامل کیا جاتا ہے کہ تحریروں میں خوب صورتی اور دل کشی پیدا ہو جاتی ہے۔ خصوصاً اُردو شاعری میں تشبیہ کا استعمال انتہائی پُر کیف اور تاثراتی ہوتا ہے۔ احمد حسین مجاہد نے اپنے کلام میں اس پہلو کو کچھ اس انداز سے برتا ہے۔ جیسے:

پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے تھے
سو دب گیا کہیں ملبے میں حوصلہ میرا (۳)

گو ہم تھے مثلِ نقشِ کفِ پا سراپا چشم
اس دل کی تجھ کو خاک اُڑاتا نہ دیکھ پائے (۴)

سرِ آئینہ ہر ذرۂ صحرا چمکتا ہے
تری پلکوں کا سایہ سا سراب آسا چمکتا ہے (۵)

جیسے میرا خوب ہے یہ زندگی
جیسے اب بیدار ہو جاؤں گا میں (۶)

مندرجہ بالا شعر میں پہاڑ کا اڑنا اس طرح بتایا گیا ہے کہ جس طرح روئی ہواؤں میں اڑ کر بکھر جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا تاریخی اشارہ بھی ہے جب محشر برپا ہو گی تو تب یہ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑیں گے مگر اس سے پہلے ۲۰۰۵ء کے زلزلے نے شہر بالاکوٹ کے بیش تر پہاڑوں کی حالت بھی روئی کی طرح کر دی تھی، جس کا تذکرہ پہلے شہر میں موجود ہے۔

اسی طرح دوسرے شعر میں شاعر نے اپنے آپ کو کسی کے پاؤں کے تلوے کے نشانات سے مشابہت دی ہے کہ انسان کی موجودگی اس عالم میں کچھ اور طرح ہوتی ہے۔ مگر جب انسان دنیا سے پردہ فرما لیتا ہے تو تب یوں لگتا ہے جیسے چلنے والا راستے سے گزر گیا اور پاؤں کے نشان رہ گئے۔ تیسرے شعر می بھی رشبیہ کی وہ قسم بیان کی ہے کہ جو اس کی وجہ اور غرض ہے۔ آخری شعر میں شاعر نے اپنی "زندگی" کو "خواب" سے تشبیہ دی ہے۔ اسکے علاوہ چند اشعار اور بھی جو تشبیہ کی بہترین عکاسی کرتے ہیں:

کچھ ایسے آسماں مرے شانے پہ آ گیا
اندھے کا پاؤں جیسے خزانے پہ آ گیا (۷)

اس کا نیاز مند ہوں اپنی مجال کے نثار
جس کا کوئی بدل نہیں ایسی مثال کے نثار (۸)

اس سے جدا ہونا ہے مجھ کو لیکن ایسے
جسم سے جیسے روح بصد دشواری نکلے (۹)

اپنی روح پہ کندہ کر اے دوست مجھے
ماں کی ممتا جیسا پیارا لفظ ہوں میں (۱۰)

مندرجہ بالا تمام اشعار میں تشبیہ کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ چوں کہ تشبیہ کے پانچ ارکان ہیں جس کی بدولت پڑھنے والا اس کو باآسانی سمجھ جاتا ہے۔ ان ارکان میں "مشبہ"، "مشبہ بہ"، "وجہ شبہ"، "حرف تشبیہ" اور "غرض تشبیہ" ہیں۔ پہلے دو ارکان کو "طرفین تشبیہ" بھی کہا جاتا ہے۔ ان تمام عناصر کی موجودگی سے تو ہر اک واقفیت حاصل کر لیتا ہے مگر بعض مقامات پر تشبیہ کو اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ اس میں کسی ایک رکن کی غیر موجودگی کی وجہ سے تشبیہ کو سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ جیسے:

اک اپسرا ہے اداسی کی خیمہ زن مجھ میں
ہر ایک سانس ہے اس ساحرہ کا دف سائیں (۱۱)

میں عشق کرتا ہوں اعلان کے بغیر میاں
یہ نظم ہوتی ہے عنوان کے بغیر میاں (۱۲)

اول شعر میں سانس کو دف کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جب کہ شعرِ دوم میں عشق کو نظم سے مشابہت دی ہے۔ ان تشبیہات میں وجہ شبہ مذکور نہیں۔ جس تشبیہ میں وجہ شبہ مذکور نہ ہو اسے تشبیہ مجمل کہا جاتا ہے۔ اسی تشبیہ جس میں تمام ارکان موجود ہوں اسے تشبیہ مفصل یا مطلق کہا جاتا ہے۔ جیسے:

یہ ہجوم سا ہے جو دشت میں کوئی اس میں اہلِ سفر نہیں
نہ کسی کے پاؤں میں آبلہ نہ کسی کی ذات میں عشق ہے (۱۳)

ادھر سے کون گزرا ہے مثالِ موجۂ خوشبو
اب تک چومتی ہے ایک دنیا نقشِ پا بیٹھی (۱۴)

مرا خوش وضع میری زندگی میں اس طرح آیا
کوئی سیاح جیسے گاؤں کے بازار میں آئے (۱۵)

احساس جیسے نیند میں ڈوبی ہوئی تھکن
جذبے میں زمہریر کے پاتال میں گلاب (۱۶)

ان اشعار میں تشبیہ کے تمام ارکان موجود ہیں کہ جس طرح پہلے شعر میں شاعر نے ہجوم کو کسی ایک خاص شخص سے تشبیہ دی ہے کہ تمام دنیا کے ہونے نہ ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا جب تک کوئی خاص فرد اس کی زندگی میں شامل نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگلے شعر میں بھی کسی شخص کو خوشبو کی مانند قرار دیا ہے کہ وہ شخص جب یہاں سے گزر چکا ہے مگر اس کی خوشبو اب بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح تیسرے شعر میں بھی شاعر نے اپنے دوست ورفیق کو سیاح سے تشبیہ دی ہے جب کہ آخری شعر میں شاعر احساس کو اور غور وفکر کو نیند اور بے پرواہی سے مشابہت قرار دیتے ہیں۔ یوں یہ تمام مثالیں تشبیہِ مفصل سے تعلق رکھتی ہیں، جو احمد حسین مجاہد کی شاعری میں خوب صورتی اور رعنائی پیدا کرتی ہیں۔

ب۔ استعارہ

علمِ بیان کا دوسرا اہم رُکن ہے۔ استعارہ کے لفظی معنی ادھار، مستعار یا "عارضی طور پر مانگ لینا" ہے۔ اصطلاحی معنوں میں استعارہ سے مراد وہ شے ہے جو کسی ایک چیز کو کسی دوسری چیز کے نام

سے ملا کر اور تشبیہ کا تعلق دے کر اس کے معنی میں کچھ نیا اضافہ کر دے۔ یعنی کسی چیز کے لوازمات کو کسی اور چیز سے منسوب کر دیں تو یہ استعارہ کہلاتا ہے۔ استعارہ کے متعلق ڈاکٹر ابوالاعجاز حفیظ صدیقی یوں رقم طراز ہیں:

"استعارہ کے لغوی معنی کسی سے کوئی چیز عاریتاً طلب کرنے کے ہیں۔ علمِ بیان کی اصطلاح میں استعارہ سے مراد وہ لفظ ہے جو مجازی معنوں میں استعمال ہو اور اس کے حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق ہو۔"(۱۷)

چوں کہ تشبیہ کے متبادل استعارہ ہے جس کے ارکان تین ہیں جن میں مستعار لہٗ، مستعار منہ اور وجہ جامع ہیں۔ جس چیز کے لیے لفظ ادھار یا جائے اسے مستعار لہٗ کہا جاتا ہے اور جو لفظ ادھار لیا گیا ہو اسے مستعار منہ کہا جاتا ہے جب کہ جو صفت اور خوبی مستعار لہٗ اور مستعار منہ میں پائی جاتی ہے اسے وجہ جامع کہتے ہیں۔

تشبیہ ہی کی طرح احمد حسین مجاہد نے اپنے کلام میں استعارہ کے پہلو کو نہایت ہی عمدہ سلیقے سے برتا ہے۔ ذیل میں چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں جو ان کے فن کی پختہ دلیل ہیں:

دیکھنا! ڈھونڈے گی جب منزل مجھے
راہ کی دیوار ہو جاؤں گا میں (۱۸)

اک دیا ہے جو پسِ چشم فروزاں ہے کہیں
یہ دِیا کل تری سرکار میں کام آئے گا (۱۹)

سراغ پائے گا میرا وہ میری موت کے بعد
بھٹک رہی ہے میری روشنی خلا میں ابھی (۲۰)

تلوار عدوّ کی تھک گئی ہے

پھر فصل سَروں کی پک گئی ہے (۲۱)

مندرجہ بالا اشعار کے پہلے شعر میں شاعر نے اپنے آپ کو راہ کی دیوار قرار دیا ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں خود کو دِیا کہا ہے، جو ابھی بجھا ہوا ہے جس کے جلتے ہی ہر طرف روشنی (مثبت و عملی کام) کرے گا۔ اگلے شعر میں شاعر نے اپنی روح کو "روشنی" کہا ہے کہ جس طرح رفتہ رفتہ فصل پک جاتی ہے ایسے ہی یہ جذبات اٹھ رہے ہیں اور دشمنانِ انسانیت کی تلوار اس فصل کو کاٹتے کاٹتے تھک جائے گی مگر یہ ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہونے والا۔

احمد حسین مجاہد کے فن کا یہ کمال ہے کہ ان کے کلام میں بعض دفعہ سارے کے سارے اشعار استعارتی انداز اپنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کی ایک نظم "تکوین کائنات" اس کی بہترین غماز ہے۔ جیسے:

یہاں سے وہاں تک ہوا ہی ہوا تھی

ہوا کے سمندر پہ پانی روانی سے نا آشنا

ایسے ٹھہرا ہوا تھا جیسے کوئی داستان گو

کہانی سناتے ہوئے سانس لینے کو ٹھہرا ہوا ہو

خموشی کے بے انت خلوت کدے میں

خدا نے بس اک حرفِ کن کا اجالا کیا

بادِ ممنون پیغامِ تخلیق لے کے چلی

اس نے پانی کے اول کو آخر پہ، ظاہر کو باطن پہ پلٹا

چھلتے ہوئے اولین آبِ تاریک کو

اس ہوا نے کناروں سے اوپر دھکیلا

پھر اس کو کچھ ایسے متھا

جیسے دیہات میں عورتیں تنگ مشکیزہ ماست کو۔۔۔۔۔

تہہ بہ تہہ ہو کے یہ آبِ تاریک

ایسا تلاطم میں آیا کہ اس کے کناروں پہ کف کے پہاڑ اُگ گئے (۲۲)

تشبیہ کی طرح استعارہ کی بھی مختلف اقسام ہیں جن میں استعارہ بالتصریح، استعارہ بالکنایہ، استعارہ بالتخیل، استعارہ و قافیہ، استعارہ نادیہ، استعارہ مطلقہ اور استعارہ مجرد وغیرہ ہیں۔ احمد حسین مجاہد کی شاعری میں استعارے کی مختلف اقسام کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

ہونے لگے ہیں گردِ تحیر میں گم نجوم

اک مشت خاک معرکۂ جستجو میں ہے (۲۳)

رکھ اس میں مشتِ خاک قدم احتیاط سے

ارواح کے خمیر کی طیب زمیں ہے عشق (۲۴)

میں نے کہا نہ تھا کہ پلٹ راہِ شوق سے

اے مشتِ خاک دیکھ میری ہم سفر نہ ہو (۲۵)

مندرجہ بالا تمام اشعار استعارہ بالتصریح کی بہترین مثال ہیں۔ یہ استعارہ کی وہ قسم ہے جس میں محض مستعار منہ مذکور ہو جب کہ مستعار لہٗ محذوف ہو۔ جیسے اوپر شعر میں "مشتِ خاک" مستعار منہ کا ذکر کیا گیا ہے جب کہ "انسان" "مستعار لہٗ" ہے جو محذوف کیا گیا ہے۔ اسی لیے یہ استعارہ بالتصریح کے زمرے میں آئے گا۔ اس کے علاوہ احمد حسین مجاہد کے کلام میں استعارے کی ایک اور قسم استعارہ بالتخیل کا عنصر بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ جیسے:

جھپکتا کیوں نہیں پلکیں

یہ بت حیران ہے شاید

ابھی آنکھوں میں آنسو ہیں
دیے میں جان ہے شاید (۲۶)

ان اشعار میں بت اور دیے سے مراد پلکیں جھپکنے اور آنسو بہانے والا انسان ہے۔ ان استعارات میں مستعار منہ، محذوف کے لوازم، مستعار لہٗ مذکور کے لیے لائے گئے ہیں۔ اسی لیے اس کو اصطلاح میں استعارہ بالتخیل کہا جاتا ہے۔ احمد حسین مجاہد کی شاعری میں بہت سے اشعار کو مختلف ڈھنگ سے برتا گیا ہے، جس سے ان کی تحریروں میں ایک خاص جھلک اور خوب صورتی نظر آتی ہے۔ ان عناصر میں ایک پہلو استعارہ بالکنایہ بھی انتہائی اہم ہے۔ استعارے کی وہ قسم ہے جو استعارہ بالتصریح کے عین متضاد ہے، جس میں مستعار منہ کا ذکر نہیں ہوتا بلکہ مستعار لہٗ کے مناسبات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جیسے:

تو سمجھنا ہی نہیں چاہتا، کیا سمجھاؤں
ناصحا! دکھ تو پہاڑوں کو بھی کھا جاتا ہے (۲۷)

جب اُس نے چھوا، میں ایک پل میں
مٹی سے چراغ بن گیا تھا (۲۸)

چہرے کی دراڑوں سے صدیوں کا سفر کر کے
اب اشک جو ٹپکا ہے اب ردِ عمل دیکھے (۲۹)

مندرجہ بالا اشعار میں مستعار لہٗ تو موجود ہیں مگر مستعار منہ محذوف ہے۔ جیسے "پہاڑ"، مستعار لہٗ اور محذوف اس کا "خوف اور عالی شان جسامت" مراد ہے۔ اسی طرح "چراغ" بننا تو مستعار لیا گیا ہے مگر خود انسان کا جسم بھی مٹی سے بنا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے "چراغ" مستعار لہٗ جب کہ "انسان کا جسم" مستعار لہٗ ہے۔ آخری شعر میں بھی چہرے کی دراڑیں مستعار لہٗ ہیں اور محذوف مستعار منہ دراصل وہ راستہ ہیں جو اشکِ مسلسل بہنے کی وجہ سے راستے بن چکے ہیں۔

احمد حسین مجاہد کے کلام میں استعارہ جیسی فنی خوبی کا استعمال بڑی چابک دستی اور ہنر مندی سے کیا ہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری تاثراتی اور جمالیاتی رنگ کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔

ج۔ مجاز مرسل

علمِ بیان کی تیسری بڑی قسم ہے۔ کسی لفظ کے حقیقی معنوں اور مجازی معنوں میں اگر تشبیہ کے سوا کوئی اور تعلق ہو تو اسے مجازِ مرسل کہا جاتا ہے۔ یعنی مجاز مرسل وہ لفظ ہے جو اپنے معنی موضوع (حقیقی) کے علاوہ معنی میں استعمال کیا جائے اور ان دونوں معنوں میں تشبیہ کے علاوہ کوئی اور واسطہ ہو۔ مجاز مرسل کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر اشفاق احمد ورک لکھتے ہیں:

> "جب کوئی لفظ حقیقی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں اس طرح استعمال ہو کہ اس میں تشبیہ کے علاوہ کوئی اور تعلق ہو تو اسے مجاز مرسل کہتے ہیں۔"(۳۰)

محققین نے مجاز مرسل کی مختلف اقسام بیان کی ہیں جن میں چیدہ چیدہ درج ذیل ہیں جو احمد حسین مجاہد کی شاعری میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ جیسے:

جزو بول کر کل مراد لینا یا کل بول کر جزو مراد لینا

مجاز مرسل کی اس قسم میں جو لفظ جزو کے لیے وضع کیا جائے تو اسے کل کے لیے استعمال کرنا اور جو لفظ کل کے لیے وضع کیا گیا ہو تو اسے جزو کے معنوں میں مراد لینا ہے۔ احمد حسین مجاہد کے کلام میں اس کی بے شمار صورتیں ہیں۔ جیسے:

بے نیازانہ گزر جائے گا تو
گاؤں کا بازار ہو جاؤں گا میں (۳۱)

دیکھے گا میرے دیکھے ہوئے خواب سارا شہر
کس کس کے غم کو میں اُجالا نہیں دیا (۳۲)
میں وہ بزدل ہوں جو ظالم کی حمایت میں اٹھا
اب مرا سر کسی بینار میں کام آئے گا (۳۳)

احمد حسین مجاہد کے ان اشعار میں مجاز مرسل کی ایک صورت نمایاں نظر آتی ہے جس میں پہلا شعر کل بول کر جزو کی طرف اشارہ کررہا ہے۔ جیسے "گاؤں کا بازار" کل ہے جب کہ "میں" جزو ہے۔ اسی طرح "سارا شہر" کل اور تیسرے شعر میں "مرا سر" جزو کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک مثال اور ملاحظہ ہو:

یہ سب کیا دھرا بس اک شخص کا مگر
الزام بے گناہ زمانے پہ آ گیا (۳۴)
کسی کو دیکھنے والی نظر بھی رکھتے تھے
سفر میں تھے تو ہتھیلی پہ سر بھی رکھتے تھے
اسے تو خوف تھا چار گام چلنے کا
ہم اپنے دل میں بچھڑنے کا ڈر بھی رکھتے تھے (۳۵)

مندرجہ بالا پہلے شعر کے مصرعہ ثانی میں "" زمانے کو کل کہا گیا ہے۔ دوسرے اور تیسرے شعر میں "سر" اور "چار گام چلنا" جزو ہیں۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاعری کی بنیادی رعنائی و حسن دراصل اس کے فن کی وجہ سے ہی ممکن ہے۔

۲۔ سبب بول کر مسبب مراد لینا یا مسبب بول کر سبب مراد لینا

مجاز مرسل کی ایک بہترین صورت ہے جس کا استعمال شاعر نے اس قدر خوب صورتی سے کیا ہے کہ پڑھنے والے پر تاثرات قائم ہو جاتے ہیں۔ جیسے:

کارِ دنیا میں لگیں وہ ٹھوکریں
پیچ سارے کھل گئے دستار کے (۳۶)

کرن جو قلب میں اتری دھنک ہوئی احمدؔ
ہم اپنے عجز میں ایسا ہنر بھی رکھتے تھے (۳۷)

مندرجہ بالا اشعار میں "دستار" سے مراد عزت و وقار ہے۔ یعنی دستار عزت و احترام کا باعث و سبب ہے۔ دوسرے شعر میں "عجز" سے مراد اخلاقیات اور پیار و محبت ہے اور "قلب" مسبب ہے آنکھوں کا۔ پہلے آنکھیں دیکھیں گی اور اس کے بعد کوئی چیز دل میں جذب ہو گی۔ جیسے دوسرے اشعار میں اس کو کچھ یوں بیان کیا گیا ہے:

میرے بوجھل پاؤں گھنگھرو باندھ کر ہلکے ہوئے
سوچنے سے کیا نکلتا دل میں ڈر رکھا ہوا (۳۸)

سر اٹھاتا نہیں میں زانو سے
کیا تعلق ہے جو نبھاتا ہوں (۳۹)

پاؤں پکڑ لیے مرے قیس نے احترام سے
مکتبِ عشق سے مجھے ایسی سند عطا ہوئی (۴۰)

"گھنگھرو باندھنا" مسبب ہے یعنی بیڑیاں پہننا یا قید ہو جانا ہے اسی طرح "سر نہ اٹھانا" مسبب ہے جو تعلق کو نبھانے کے لیے عاجزی و انکساری اختیار کیے ہوئے ہے۔ "پاؤں پکڑنا" سبب ہے جس کا مطلب عزت دینا اور عالی شان مقام و مرتبہ عطا ہونا ہے۔ اسی طرح مجاز مرسل کی تیسری بڑی صورت ظرف بول کر مظروف یا مظروف بول کر ظرف مراد لینا ہے جو احمد حسین مجاہد کی شاعری کا ایک جان دار پہلو ہے۔

۳۔ ظرف بول کر مظروف مراد لینا یا مظروف بول کر ظرف مراد لینا۔

احمد حسین مجاہد کے کلام میں دیگر فنی محاسن کی طرح مجاز مرسل کا یہ عنصر بھی نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ وہ کبھی ظرف بول کر مظروف مراد لیتے ہیں تو کبھی مظروف بول کر ظرف مراد لیتے ہیں۔ جیسے:

اِک مشتِ گِل کُوزہ سے آئی مجھے آواز
دعویٰ تو ہمیں بھی تھا بہت کوزہ گری کا (۴۱)

یہ تیرے غم کے بیاں کی ساعت ہے جانِ احمدؔ
بدن سے کھینچ کر لہو دواتوں میں آ گیا ہے (۴۲)

میں نے سب پیرائے عرضِ حال کے برتے مگر
ان کہی باتوں کی گٹھڑی دَم بدم بھاری ہوئی (۴۳)

پہلے شعر میں "مست گل کوزہ" ظرف ہے جو اس کی تخلیق اور کوزہ گری کو مظروف بنا رہا ہے۔ اگلے شعر میں "لہو کا دواتوں میں آنا" مظروف ہے اور اس کا ظرف قلم ہے جس کے ذریعے ہر انسان خیالات کا اظہار کر سکتا ہے۔ آخری شعر میں "باتوں کی گٹھڑی " بھی ظرف ہے جس کا مظروف کوئی کتاب یا نامۂ اعمال ہے۔ اس طرح چند اشعار مزید اس کی وضاحت کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں:

مصرف نکل ہی آتا ہے بیکار چیز کا
لاتا ہوں بھیک باپ کی پگڑی میں ڈال کے (۴۴)

مشکیزہ بھر کے خون سے لایا سوائے خیام
نوکِ سناں پہ جم گیا پانی فرات کا (۴۵)

۴۔ مضاف کہہ کر مضاف الیہ یا مضاف الیہ کہہ کر مضاف مراد لینا۔

مجاز مرسل کی ہی ایک صورت ہے جس میں شاعر مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کی جگہ استعمال کرتا ہے یا پھر مضاف الیہ کو احذف کر کے مضاف کو اس کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔ احمد حسین مجاہد کے کلام میں بھی یہ عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے چند منتخب اشعار ملاحظہ کیجیے:

اربابِ اختیار کو طاقت کا زعم تھا
میری مطیع خلقِ خدا عشق سے ہوئی (۴۶)

ذہن میں ابھرتے ہیں خدوخال سے احمدؔ
یاد سی کوئی میرے دل پہ پاؤں دھرتی ہے (۴۷)

مجھ میں دنیا کے لیے ہے کیا کشش جو
میرے دروازے پر آ کر بھونکتی ہے (۴۸)

مندرجہ بالا اشعار میں "اربابِ اختیار" مضاف "دل پہ پاؤں دھرنا" مضاف الیہ اور "دنیا" مضاف جب کہ "بھونکنا" مضاف الیہ ہے۔ اسی طرح مزید دیکھیے:

خوش ہوں کہ اپنے حق سے میں ہوتا ہوں دست کش
مجھ سے تُو خوف کھا، میں بڑا ہوشیار ہوں (۴۹)

دائم آباد محفلِ یاراں
میں ابھی گھر سے ہو کے آتا ہوں (۵۰)

مجھ سے لپٹا تو مری پشت سے احمد اس نے
میرے دشمن کی طرف ہاتھ بڑھایا ہوا تھا (۵۱)

پہلے شعر میں مضاف حذف کر کے مضاف الیہ کی صورت پیدا کی گئی ہے۔ دوسرے شعر

میں مضاف کا استعمال کیا گیا ہے کہ "محفلِ یاراں" اور "گھر" مضاف ہیں جب کہ آخری شعر میں شاعر نے مضاف کو حذف کر دیا ہے کہ جس میں اس کا دوست، رفیق اور ساتھی ہے مگر مضاف الیہ اس کا صرف ہاتھ ہے۔

احمد حسین مجاہد کی شاعری میں علمِ بیان کی تمام اقسام انتہائی دل کشی کے تاثرات پیدا کرتی ہیں۔ اسی لیے ان کی شاعری فنی محاسن کی پختگی کی وجہ سے اپنے دائرے وسیع کرتے ہوئے فکری سطح پر اس میں فکری رجحانات تاثراتی وشعوری عمل تخلیق کرتے ہیں۔

د۔ کنایہ

علمِ بیان کی آخری اور اہم قسم کنایہ ہے جس کے لغوی معنی مجاز کے ہیں یعنی پوشیدہ بات پردوں اور اشاروں میں بیان کرنا۔ اس میں لفظ حقیقی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں استعمال ہوتا ہے مگر حقیقی معنوں کو بھی اصل مان لینا کوئی حرج نہیں، لیکن شاعر کا مقصد مجازی معنی ہی ہوتے ہیں۔ کنایہ میں کلام کی تصریح نہیں کی جاتی بلکہ مجاز مرسل میں صرف مجازی معنی مراد لیے جاتے ہیں جب کہ کنایہ میں حقیقی معنی بھی مراد لیے جاسکتے ہیں۔ کنایہ کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر اشفاق احمد ورک "کلیدِ اُردو" میں لکھتے ہیں:

> "لغوی طور پر کنایہ کے معنی پوشیدہ یا چھپی ہوئی بات کے ہیں۔ علمِ بیان کی رو سے کنایہ اس کو کہتے ہیں کہ جب کوئی لفظ حقیقی معنوں کے بجائے غیر حقیقی معنوں میں اس طرح استعمال ہو کہ اگر اس کے حقیقی معنی بھی مراد لیے جائیں تو بھی مفہوم میں فرق نہ آئے۔ دوسرے معنوں میں کنایہ وہ کلمہ ہے جس کے معنی خفیہ اور پوشیدہ ہوں اور ان کا سمجھنا کسی قرینے کا محتاج ہو۔" (۵۲)

احمد حسین مجاہد کی شاعری میں دیگر فنی محاسن کی طرح یہ راز و نیاز کی اور رمز و ایمائیت کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہو سکے تو گنگنا مجھ کو کبھی تو
تیرے لہجے میں بلا کی تازگی ہے (۵۳)

دھند کے اس پار کیا ہے اب بتا سکتا ہوں میں
زندگی گزری ہے میری ذات کے ادراک میں (۵۴)

خون جلنے کی بُو آتی ہے لفظوں سے
میں بھی جانے کیا کیا لکھتا رہتا ہوں (۵۵)

میں زندگی کے گہرے سمندر میں تیر کر
اندھے کنویں کے تنگ دہانے پہ آ گیا (۵۶)

"بلا کی تازگی" اگرچہ حقیقی معنی بھی مراد لیے جاسکتے ہیں مگر مجازی معنوں میں اس سے مراد کوئی بہت بڑی آفت ہے،"دھند کے اس پار" کے مجازی معنی یہ ہیں کہ انسان کی آنکھوں میں حقیقت کے بجائے ان پر ایک پردہ ہے جو کسی بھی چیز کو دیکھنے کی سکت نہیں رکھ سکتیں،"خوں جلنا" حقیقت ہے مگر یہاں اس سے مراد درد و غم کی کیفیت ہے جب کہ آخر میں شاعر نے "زندگی کے گہرے سمندر" کو مشکلات و مصائب مراد لے کر زندگی کو محدود کر کے پیش کر دیا ہے۔یہی وہ فنی خوبی ہے کہ جس کے تحت قارئین کے دل و دماغ پر ایک ایسی گہری چھاپ پڑتی ہے کہ وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔اسی طرح احمد حسین مجاہد لکھتے ہیں:

دوزخ سی ہو کے آتی ہے جیسے لبوں پہ بات
احمد حسین رنج اک ایسا لہو میں ہے (۵۷)

وقت کسی کا نہیں، دیکھ! مرے خوش گماں
تیری طرح تھے کئی رشکِ سحر اور بھی (۵۸)
بیچ بھنور کے اس نے اتار دیا کشتی سے
میں نے رختِ سفر میں آئینہ رکھا تھا (۵۹)

"دوزخ سے ہو کر آنا" سے مراد انسان کا اندرون بھی جہنم جیسا گرم اور سخت ہے۔ جس طرح "جہنم" نام ہی آگ اور جلانے کا ہے بالکل اسی طرح شاعر نے یہاں مجازی معنوں میں اپنے اندر کی حالت کا دوزخ سے موازانہ کیا ہے۔ اسی طرح "وقت کسی کا نہ ہونا" حقیقت پر مبنی ہے مگر مجازی معنوں میں اس سے مراد کہ ہر انسان کا دنیا میں وقت مقرر و معین ہے اور ایک دن اس جہانِ فانی سے کوچ کرنا ہے کہ جیسے باقی تمام لوگ رفتہ رفتہ اس جہاں سے پردہ کر گئے۔ مزید آخری شعر میں "بیچ بھنور کے کشتی سے اتارنے" کو مجازی معنوں میں استعمال کیا ہے کہ مشکلات آنے پر لوگ تنہا چھوڑ دیتے ہیں کہ جس طرح سفر پہ چلتے ہوئے بیچ بھنور کے کسی کو کشتی سے اتار پھینک دیا جائے۔ اس طرح یہ معلوم ہوا کہ رمز و ایمائیت بھی شاعری کی ہی ایک دل کش صورت ہے جس کو شاعر استعمال کرتے ہوئے پردوں اور اشراوں سے اپنی بات دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ جیسے:

بینائی کے چولہے میں دبی راکھ سے نکلا
میں کوکھ جلی آنکھ کی پوشاک سے نکلا (۶۰)
دیر سے چشمَ شفق آسا میں تھا
اب سر رخسار ہو جاؤں گا میں (۶۱)

یہ اشعار بھی کنایہ کی بہترین مثال ہیں جن میں آنکھ سے بہنے والے آنسو کے لیے کنایہ لیا گیا ہے۔ جیسے بینائی کے چولہے سے راکھ نہیں نکلتی بلکہ آنسو نکلتا ہے۔ دوسرے شعر میں "چشم شفق آسا" سے بھی مراد آنسو ہی ہے کیوں کہ آنکھ کے شفق سے آنسو بہتا ہے نا کہ سورج نکلتا ہے۔ مختصر

یہ کہ احمد حسین مجاہد کے کلام میں علمِ بیان کی تمام صورتیں موجود ہیں۔ وہ جہاں فکری پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں وہاں ساتھ ساتھ فنی خصائص کو بطریقِ احسن برتتے ہیں جس سے ان کے کلام میں تازگی اور جدت و نُدرت کے نئے پیرائے ملتے ہیں اور قارئین پر گہرے تاثرات مرتب ہوتے ہیں۔

۳.۲ علمِ بدیع

علمِ بدیع ایک ایسا علم ہے جس میں شاعر اپنی شاعری میں مختلف صنعتوں کا استعمال کر کے اسے خوب صورت اور حسن آفرینی بخشتا ہے۔ ساتھ ساتھ فن پاروں میں لفظی اور معنوی خصوصیات دریافت کر کے اپنی تحریروں میں صنائع لفظی و صنائع معنوی کی تصریح کی جاتی ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر فاروق چوہدری لکھتے ہیں:

> "علمِ بدیع وہ علم ہے جس میں محسناتِ کلام یعنی صنائع لفظی اور صنائع معنوی کی تصریح کی جاتی ہے، بدیع کے بیان میں بتایا جاتا ہے کہ بلاغت کے علاوہ اور کون سے طریقے ایسے ہیں جن سے کلام میں حسن اور خوبی پیدا کی جاسکتی ہے۔"(۶۲)

علمِ بدیع میں دو اہم عناصر صنائع لفظی اور صنائع معنوی ہیں۔ "بحر الفصاحت" میں صنائع لفظی کی اٹھاون (۵۸) اور صنائع معنوی کی ترپین (۵۳) اقسام درج ہیں۔ ان اقسام میں چند چیدہ چیدہ اقسام پیش کی جارہی ہیں جن سے احمد حسین مجاہد کا کلام مزیّن ہے۔

صنعت سیاقۃ الاعداد

علمِ بدیع کی وہ قسم ہے جس کے ذریعے شاعر الفاظ میں ایک نئی معنویت پیدا کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا فن ہے جس میں گنتی کے چند اعداد لائے جاتے ہیں اور الفاظ کے حسن و نزاکت اور اس کے

معنی میں ایک اہم اضافہ ہوتا ہے۔ احمد حسین مجاہد نے کلام میں اس فنی خوبی کو بڑی مہارت سے پیش کیا ہے۔ جیسے:

تم سے کرنی ہے کوئی بات ضروری مجھ کو
دو گھڑی رنجِ ملاقات سے باہر نکلو (۶۳)

خالقِ کون و مکاں! زہر سہی زندگی
مہلتِ یک دو نفس چاہیے پَر اور بھی (۶۴)

بس ایک زخم تھا ہم جس کو سل سمجھتے رہے
ذرا سے دکھ کو غمِ مستقل سمجھتے رہے (۶۵)

ان اشعار کے پہلے شعر میں لفظ "دو" دوسرے شعر میں "یک دو" اور تیسرے شعر میں "ایک" یہ تمام الفاظ اعداد ہیں، اسی لیے اسے سیاقۃ الاعداد کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چند مثالیں مزید ملاحظہ کریں جو احمد حسین مجاہد کے کلام میں معنوی اضافے کے ساتھ ساتھ اس میں اچھوتا پن نمایاں نظر آتا ہے۔ جیسے:

اس وقت کی تلاش میں گزری ہے زندگی
صدیاں جب ایک پل گزر جائیں دوستو (۶۶)

صدیوں بعد احمدوقت کے ہاتھوں سے
جو متروک نہ ہو اک ایسا لفظ ہوں میں (۶۷)

جس میں غم کی خوشبو صاف دکھائی دے
ایسی ہر تحریر کا پہلا لفظ ہوں میں (۶۸)

تجھے کھونے کا دکھ بھی، چار جانب خلا بھی ہے
مگر میں سانس لیتا ہوں تو جنگل گونجتا بھی ہے (۶۹)

اسی طرح پہلے شعر کے مصرعۂ ثانی میں لفظ "صدیاں" اور "ایک پل" اگلے شعر میں مصرعۂ اول میں "صدیوں" اور مصرعۂ ثانی میں "اک" تیسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں لفظ "پہلا" جب کہ آخری شعر کے اول مصرعہ میں "چار جانب" تعداد کو ظاہر کرتے ہیں، اسی لیے اس کو سیاقۃ الاعداد کہا جاتا ہے، جو احمد حسین مجاہد کی شاعری کا ایک حسین پہلو ہے اور کلام میں بکثرت مستعمل ہے۔

صنعت مراعاۃ النظیر

مراعات کے معنی "ملحوظ رکھنا" جب کہ نظیر کے معنی "مثال" کے ہیں۔ یہ ایک ایسی صنعت ہے جس میں شاعر کسی ایک چیز کی موجودگی میں اس کی نسبت سے ایسے الفاظ لاتا ہے کہ وہ اس طرح ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتے ہیں جو آپس میں مناسبت رکھتے ہیں اسے مراعاۃ النظیر کہا جاتا ہے۔ اس صنعت کی تعریف کرتے ہوئے پروفیسر حمید اللہ شاہ یوں گویا ہیں:

> "کلام میں ایسی اشیا کا ذکر کرنا جن میں تضاد یا تقابل کے سوا کوئی اور نسبت ہو۔ مثلاً گل، لالہ، بلبل، چمن کا ایک ذکر کرنا، اس صنعت کو توفیق، تلفیق اور ابتلاف بھی کہتے ہیں۔" (۷۰)

احمد حسین مجاہد کی شاعری دیگر فنی خصائص سے بھرپور ہے۔ ان فنی خصوصیات میں ان کا کلام صنعت مراعاۃ النظیر جیسی صنعت سے آراستہ ہے اور اس صنعت کو بڑی عمدگی سے برتا ہے۔ جیسے:

اُنگلی پہ مری گھومنے لگتی ہے زمیں
سورج مری مٹھی میں پگھل جاتا ہے (۷۱)

یہ کس دیار کی مٹی مرے خمیر میں ہے
کہ جسم، روح سے ہلکا دکھائی دیتا ہے (۷۲)

فصل کاٹیں گے کاٹنے والے
میں تو بس بوجھ ہی اٹھاتا ہوں (۷۳)

پہلے شعر میں گھومنے کی نسبت سے زمین اور سورج کے الفاظ لائے گئے ہیں جو اپنے اپنے مدار میں گھومتے ہیں۔ دوسرے شعر میں مٹی کی مناسبت سے خمیر اور جسم جب کہ تیسرے شعر میں فصل کی مناسبت سے کاٹنا اور بوراٹھانا مراعاۃ النظیر کو ظاہر کر رہے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

اندر کے زلزلوں سے دراڑیں سی پڑ گئیں
کب تک رکھیں بدن کی عمارت سنبھال کر (۷۴)

ایک ہم ہی تو نہیں محوِ سفر اس سمت میں
سب کی منزل شہر شب ہے قافلہ کوئی بھی ہو (۷۵)

غم دنیا خریدے گا کوئی سستا کھلونا
شکستہ ہوں مگر اب بھی مری قیمت بہت ہے (۷۶)

مندرجہ بالا شعر میں زلزلے کی مناسبت سے عمارتیں اور دراڑیں کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ دوسرے شعر میں بھی سفر کی نسبت منزل شہر اور قافلہ جب کہ آخری شہر میں خریدنے کی مناسبت سے کھلونا اور قیمت جیسے الفاظ برتے گئے ہیں۔

صنعت لف و نشر

علمِ بدیع کی ایک صنعت ہے جس کے معنی لپٹنا اور پھیلانا ہیں یعنی کلام میں چند چیزیں بیان کر کے اس کے بعد ہر چیز کی مناسبت سے تعین کیے بغیر بیان کی جائیں۔ اس صنعت کے بارے میں ڈاکٹر

فاروق چوہدری لکھتے ہیں:

"لف کے معنی لپٹنے اور نشر کے معنی پھیلانے کے ہیں لیکن
اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ کلام میں پہلے چند چیزیں بیان کی جائیں اور
اس کے بعد ہر چیز کے مناسبات اور متعلقات بغیر کسی تعین کے
بیان کیے جائیں۔"(۷۷)

صنعت لف و نشر میں بعض مناسب اور متعلقات مرتب ہوتے ہیں اور بعض جگہ پر غیر مرتب ہوتے ہیں۔ احمد حسین مجاہد کی شاعری میں بھی اس صنعت کا بہترین استعمال ہوا ہے۔ اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

عجز بیاں کی قوسِ قزح ہاؤ ہُو میں ہے
دل میں ہے جو ہوس وہ کہاں گفتگو میں ہے (۷۸)

بل کھاتے رستے، تنہا اکیلے، پیڑوں کی لمبی قطار
منزل نہ پاؤں، چلتا ہی جاؤں، آنکھوں میں جگنو بھرے (۷۹)

وہ اس کے عارض و لب، وہ خرامِ ناز اس کا
گلاب کھلتے ہوئے، کھیت لہلہاتے ہوئے (۸۰)

مندرجہ بالا اشعار میں صنعتِ لف و نشر کو پیش کیا گیا ہے جس طرح پہلے شعر میں مصرع اول میں عجز بیاں کی نسبت سے دل اور ہو کی نسبت سے گفتگو کے تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے شعر میں "بل کھاتے رستے" کا تعلق منزل نہ پانا، "تنہا اکیلے" کا تعلق چلتا ہی جاؤں جب کہ " پیڑوں کی لمبی قطار" کی مناسبت سے آنکھوں میں جگنو بھرے جیسے الفاظ ایک دوسرے کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح آخری شعر میں بھی "عارض و لب" کو گلاب کے کھلنے اور "خرامِ ناز" کو کھیت کے لہلہانے سے نسبت دی ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ احمد حسین مجاہد کا کلام مختلف صنعتوں کے

استعمال سے کس قدر مزیّن اور دل کش ہے۔ لف و نشر غیر مرتب کی مثال دیکھیے کہ جس کا استعمال شاعر نے کس خوب صورت انداز میں کیا ہے:

یہ جو کھلتے ہی چلے جاتے ہیں مجھ پر اَسرار
ہم نَفَس! یہ تو کوئی راز بھی ہو سکتا ہے (۸۱)

دشت تھا، دھوپ تھی، وہ یاد بھی آیا ہوا تھا
ایسی وحشت تھی کہ انت مچایا ہوا تھا (۸۲)

پہلے شعر کے پہلے مصرعے میں "کھلتے ہی چلے جاتے ہیں" کی نسبت سے مصرع ثانی میں لفظ "راز" سے ہے اور "مجھ پر اسرار" کا تعلق بھی "ہم نفس" سے ظاہر کیا ہے۔ دوسرے شعر میں "دشت اور دھوپ" کا تعلق انت مچانے سے جب کہ "وہ یاد بھی آیا ہوا تھا" کو وحشت سے مناسبت دی ہے جو لف و نشر غیر مرتب کی بہترین مثالیں ہیں۔ لف و نشر مرتب و غیر مرتب کے متعلق احمد حسین مجاہد کے چند منتخب اشعار دیکھیے:

نہ سہی اگر وہ مرا نہیں، کسی اور کا بھی نہیں ہوا
چلو اس کی بات بھی رہ گئی، چلو مرا زخم بھی بھر گیا (۸۳)

گناہ کر نہیں سکتا، گناہ سوچتا ہوں
میں کیا کروں مری اوقات ہی کچھ ایسی ہے (۸۴)

مندرجہ بالا تمام اشعار صنعت لف و نشر کی بہترین مثالیں ہیں جن کا استعمال احمد حسین مجاہد نے بڑے سلیقے سے کیا ہے جس سے ان کے کلام میں تازگی اور اثر آفرینی جیسے عناصر جنم لیتے ہیں اور نئے نئے معنی و مفہوم سے قاری روشناس ہوتا ہے۔

صنعتِ تکرار

شاعری میں ایسے الفاظ لانا جو معنی و مطلب میں ایک جیسے ہوں اور کلام میں زور اور حسن بھی پیدا کریں اسے صنعتِ تکرار کہتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر فاروق چوہدری:

"کلام میں ایسے الفاظ لائے جائیں جن کی تکرار سے کلام میں زور اور حسن پیدا ہو جائے۔"(۸۵)

احمد حسین مجاہد کی شاعری میں اس صنعت کا استعمال جا بجا ملتا ہے جس کی وجہ سے ان کے کلام میں ایک خاص قسم کی موسیقیت اور ترنم پیدا ہوتا ہے اور شاعری کا حسن بھی دوبالا ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں احمد حسین مجاہد کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اس بار بھی شکست مرے وہم کی ہوئی
اس بار بھی وہ میرے بلانے پہ آ گیا (۸۶)

ورنہ میں کس شمار میں ورنہ میں کس قطار میں
میں بھی ہوں صاحبِ نظر قحطِ کمال کے نثار (۸۷)

برسا جو کشتِ جاں پہ وہ بادل قیاس تھا
میں آج بھی اداس ہوں کل بھی اداس تھا (۸۸)

ذرا سی بات حائل ہے ہمارے درمیاں احمدؔ
ذرا سی بات کے پیچھے مگر اک واقعہ بھی ہے (۸۹)

ان اشعار کے پہلے شعر میں لفظ "اس بار بھی" مکرر آئے ہیں۔ دوسرے اور تیسرے شعر میں "ورنہ میں کس" اور "اداس" کی تکرار جب کہ آخری شعر میں "ذرا سی بات" صنعتِ تکرار کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس تکرار کی وجہ سے کلام میں ایک جانب زور و اثر پیدا ہوتا ہے تو دوسری جانب حسن و دل کشی اور موسیقیت بھی جنم لیتی ہے۔ اس حوالے سے اشعار ملاحظہ کیجیے:

اوڑھ لیتا ہے خدوخال بھی گاہے گاہے

اک تصور مجھے تصویر بنا جاتا ہے (۹۰)

آنکھوں آنکھوں ہی میں ہو جاتی ہیں باتیں احمدؔ

بات کیا ہے کہ کوئی بات نہیں بھی ہوتی (۹۱)

وہ اور کہیں سے آرہی تھی

میں اور کہیں گیا ہوا تھا (۹۲)

ہائے! یہ رازِ رائگانی عشق

ہائے! میں تجھ سے کیا چھپاتا ہوں (۹۳)

یہاں پہلے شعر میں "گاہے گاہے" اگلے شعر میں "آنکھوں آنکھوں" اور "بات" اس کے بعد "اور کہیں" اور آخری شعر میں "ہائے" کی تکرار میں خوب صورتی اور دل کشی جنم لیتی ہے۔ احمد حسین مجاہد کے کلام میں دیگر فنی عناصر کی طرح اس صنعت کا استعمال بھی کثرت سے ملتا ہے جس سے ان کے کلام کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

صنعتِ تضمین

تضمین کے لغوی معنی جگہ دینا، شامل کرنا یا ملانا کے ہیں۔ ادبی اصطلاح میں صنعتِ تضمین سے مراد وہ صنعت ہے جس میں شاعر کسی مشہور مضمون یا شعر کو اپنے کلام میں داخل کرتا ہے یا پھر دوسرے کے شعر پر مصرعے یا بند لگاتا ہے۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک اس ضمن میں یوں رقم طراز ہیں:

> "علمِ بدیع کی اصطلاح میں شاعر کا اپنے کلام میں کسی دوسرے شاعر کے کلام سے کوئی مصرع یا شعر اس طرح لانا کہ سرقہ کا احتمال نہ ہو۔ مستعار مصرع یا شعر واوین میں لکھا جاتا ہے۔ اس طرح کلام میں زور اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات مضحک صورت

پیدا کرنے کے لیے بھی صنعت تضمین کا استعمال کیا جاتا
ہے۔"(۹۴)

احمد حسین مجاہد کی نظم اور غزل دونوں اصناف میں اس صنعت کا استعمال کیا گیا ہے، جس میں خاص طور پر کلاسیکی شعرا کی شاعری کے مصرعے بطور پیوند کر کے اپنے کلام میں زور اور تاثیر کے کے عناصر مہیا کیے ہیں۔ ان کلاسک شعرا میں ایک نام اثرؔ لکھنوی کا بھی ہے جن کے بعض مصرعے شاعر نے کچھ اس طرح برتے ہیں۔ جیسے:

"آنکھوں سے لہو ٹپک رہا ہے"
صحرا کو زبان مل گئی ہے (۹۵)

اس شعر کا پہلا مصرع تضمین کیا ہے جب کہ اثرؔ لکھنوی کا اصل شعر کچھ یوں مشہور ہے:

اب آئے بہار یا نہ آئے
"آنکھوں سے لہو ٹپک رہا ہے" (۹۶)

اس کے علاوہ احمد حسین مجاہد نے علامہ اقبالؒ کی ایک فارسی رباعی کا ترجمہ کر کے اپنے ایک مجموعے کی ابتدا میں پیش کیا ہے۔ اگرچہ اس کو ہم تضمین نہیں کہہ سکتے مگر تضمین کا حصہ ضرور کہیں گے۔ چوں کہ احمد حسین مجاہد نے اس رباعی کو من و عن فارسی سے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ رباعی ملاحظہ کیجیے:

تُو غنی ہے دو جہاں سے، میں فقیر ہوں رہگزار
روزِ محشر لاج رکھ لینا مری پروردگار
پھر بھی جو لازم ہو میرے دفترِ عصیاں کی جانچ
مصطفیٰؐ کے سامنے کرنا نہ مجھ کو شرمسار (۹۷)

مندرجہ بالا رباعی احمد حسین مجاہد نے اقبالؒ کی فارسی رباعی کو اپنی شاعری کا حصہ بنا کر، پیوند

لگا کر کلام کا حصہ بنایا ہے جو تضمین کی بہترین مثال ہے۔

صنعتِ تضاد

تضاد عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ضد اور اختلاف کے ہیں۔ ادبی اصطلاح میں صنعتِ تضاد سے مراد کلام میں دو ایسے الفاظ لانا جو ایک دوسرے کی ضد یا الٹ ہوں، صنعتِ تضاد کہلاتی ہے۔ اس صنعت کے حوالے سے ڈاکٹر صابر کلوروی رقم طراز ہیں:

"کلام میں دو یا دو سے زیادہ ایسے الفاظ لانا جو ایک دوسرے کی ضد ہوں، مثلاً خوشی و غم، دن اور رات۔"(۹۸)

احمد حسین مجاہد نے صنعتِ تضاد کو فنی مہارت سے برتا ہے۔ ان کے کلام میں اس صنعت کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں جو اُن کے فن کے پختہ اور بین ثبوت ہیں۔ اس حوالے سے چند اشعار درج ذیل ہیں:

اس کا عروج مدعا اس کی خوشی عزیز ہے
اپنی شکست پر فدا اپنے زوال کے نثار
ہجر بھی عین وصل ہے وصل بھی ایک خواب ہے
جو بھی ہے اس کے دم سے ہے اپنے خیال کے نثار (۹۹)

احمد بزعم خود تھے سبھی سلسلے مرے
وہ مجھ کو پا کے خوش ہے نہ کھو کر اداس تھا (۱۰۰)

امکان کے فسوں سے عبارت ہے کائنات
ہر چیز ایک وہم ہے لیکن یقیں ہے عشق
اظہار کے لیے جسے کر لے یہ منتخب
اس کی بقا کا بعدِ فنا بھی امیں ہے عشق (۱۰۱)

باہر بھی اک خلا مرے اندر بھی اک خلا
مجھ پر کبھی تو راز مرا کھول اے خدا (۱۰۲)

پہلے شعر میں ""عروجاور"زوال"، "ہجر"اور "وصل"ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دوسرے شعر میں "پاکر"اور "کھوکر"، تیسرے شعر میں "وہم اور یقین"اور "بقا اور فنا"جب کہ آخری شعر میں "باہر اور اندر"صنعتِ تضاد کو ظاہر کرتے ہیں۔ صنعتِ تضاد کے ضمن میں چند منتخب اشعار ملاحظہ کیجیے:

ساتھ ہوتی ہے مگر ساتھ نہیں بھی ہوتی
ہو بھی جاتی ہے ملاقات، نہیں بھی ہوتی
ہو بھی آتا ہوں میں افلاک سے بیٹھے بیٹھے
اس طرح سیر سماوات نہیں بھی ہوتی (۱۰۳)

جہاں جہاں ہے اندھیرا مجھے وہاں سے گزار
یہ روشنی تو مرا دائمی حوالہ ہے (۱۰۴)

سکوتِ شب میں گلے مل رہے ہیں ارض و سما
ورائے حدِ بیاں! مجھ پہ منکشف ہو جا (۱۰۵)

مندرجہ بالا اشعار میں "ساتھ ہوتی ہے"اور "ساتھ نہیں ہوتی"، "افلاک"اور "سماوات"، "اندھیرااور روشنی"اور "ارض و سما"ایسے الفاظ ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ان کے اختلافات کی بدولت کلام میں جو حسن و لطافت پیدا ہوتی ہے پڑھنے والا اتنا ہی اس سے محظوظ ہوتا ہے۔ احمد حسین مجاہد کے کلام میں صنعتِ تضاد کا استعمال انتہائی دل کش ہے۔ وہ اس کے استعمال سے کلام کو پُر تاثیر اور معنی خیز بناتے ہیں۔ اس لیے یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ علمِ بدیع کے تمام صنائع لفظی و صنائع معنوی خصائص کو احمد حسین مجاہد بطریقِ احسن برتتے ہیں اور قارئین کو بہترین ماحول فراہم کر

کے اس کی اصل حقیقت سے آگاہ کرتے جاتے ہیں۔

صنعتِ تلمیح

تلمیح کے لغوی معنی "آنکھ چرا کر دیکھنا" یا "اشارہ" کرنے کے ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں تلمیح سے مراد شاعری میں کسی مشہور واقعے، قصے، قرآنی آیت اور مشہور شخصیت کا ذکر کرنا یا ان کی طرف اشارہ کرنا صنعتِ تلمیح کہلاتی ہے۔ اس حوالے سے ابوالاعجاز حفیظ صدیقی یوں رقم طراز ہیں:

> "زبان کے ابتدائی دور میں چھوٹے چھوٹے سادہ خیالات اور معمولی چیزوں کے بتانے کے لیے الفاظ بنائے گئے تھے۔ رفتہ رفتہ انسان نے ترقی کا قدم اور آگے بڑھایا۔ لمبے لمبے قصوں اور واقعات و حالات کی طرف خاص خاص لفظوں کے ذریعے اشارے ہونے لگے۔ جہاں وہ الفاظ زبان پر آئے وہ قصے وہ واقعے آنکھوں کے سامنے پھر گئے ایسا ہر اشارہ تلمیح کہلاتا ہے۔"(۱۰۶)

احمد حسین مجاہد کی شاعری میں جہاں دیگر صنعتوں کا استعمال بکثرت ملتا ہے وہاں صنعتِ تلمیح بھی سرِ فہرست ہے۔ کیوں کہ ان کے کلام کو پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ان کے کچھ اشعار آیاتِ کریمہ کا ترجمہ ہیں۔ اس حوالے سے چند منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیے:

سقراط میرے عہد کا سولی پہ چڑھ گیا
مہلک ترین زہر کا پیالہ اچھال کے

احمدؔ صدائے عشق میں کیسا طلسم تھا
چرچے تھے آسماں پہ اذانِ بلال کے (۱۰۷)

قسم ہے عصر کی انسان ہے خسارے میں
ہر ایک رشتے میں اس کا مفاد بولتا ہے (۱۰۸)

مشکیزہ بھر کے خون سے لایا سوئے خیام
نوکِ سناں پہ جم گیا پانی فرات کا (۱۰۹)

پہلے شعر میں سقراط کی سزائے موت کی طرف اشارہ ہے، ساتھ ہی نبی کریم ﷺ کے جان نثار و غلام حضرت بلال کے اذان کے واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ اگلے شعر میں سورۃ الکوثر کا معنی و مفہوم ہے جب کہ آخری شعر میں عمر خیال جو کہ ایک فلسفی، شاعر اور ریاضی دان تھا، کو تلمیح کیا اور دریائے فرات کی طرف بھی اشارہ کیا کہ میدانِ کربلا میں حضرت امام حسینؓ پر اس دریا کا پانی بند کر دیا گیا تھا۔

احمد حسین مجاہد کی وسعتِ علمی کا اندازہ ان کی ایک رباعی سے بخوبی کیا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے مختلف مشہور ادبی شخصیات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ رباعی ملاحظہ ہو:

اقبالؔ کے افکار سے سرشار ہوں میں
اور میرؔ کے لہجے کا پرستار ہوں میں
اسلوب، سخن میں ہے مرا اپنا ہی
یہ سچ ہے کہ غالبؔ کا طرف دار ہوں میں (۱۱۰)

اس رباعی میں اقبالؔ کے فکری رجحانات، میرؔ تقی میر کی سخن وری اور غالبؔ کی غالبیت کی طرف ایک معنی خیز اشارہ کیا ہے جو صنعتِ تلمیح کے زمرے میں ہی آتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کی متعدد تلمیحات ہیں جن کو پڑھتے ہی ذہن اس جگہ پر پہنچ جاتا ہے جہاں شاعر کا مقصود ہو۔ جیسے:

پاؤں پکڑ لیے مرے قیس نے احترام سے
مکتبِ عشق سے مجھے ایسی سند عطا ہوئی (۱۱۱)

سپردِ آبِ رواں کردیا تھا ماں نے مجھے
میں محترم ہوں، مجھے دشمنوں نے پالا ہے (۱۱۲)

اُس نے یہ کہہ کر مجھے میری غزل لوٹا دی
یہ قصیدہ تمھیں دربار میں کام آئے گا (۱۱۳)
یونہی یثرب سے نہیں بنتا مدینہ کوئی شہر
عدل کرتے تھے محمدؐ مگر احسان کے ساتھ
میرا ہر سانس ہو بوصیریؒ کا مصرع احمدؔ
روزِ محشر وہ بلائیں مجھے حسان کے ساتھ (۱۱۴)

مندرجہ بالا پہلے شعر میں قیس کا ذکر ہے۔ دوسرے شعر میں حضرت موسیٰؑ کی طرف اشارہ ہے، تیسرے شعر میں قدیم دور کے بادشاہوں کے دربار میں پڑھے جانے والے قصائد کو موضوع بنایا ہے جب کہ آخری اشعار میں مدینہ منورہ اور اصحابِ رسول ﷺ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان تمام اشارات کو ادبی اصطلاح میں صنعتِ تلمیح کہا جاتا ہے۔ اس صنعت کا استعمال احمد حسین مجاہد نے اپنے کلام میں اس طرح پیوست کر دیا ہے کہ پڑھتے ہوئے ذہن فوراً پورے واقعے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح ایک تو شاعر کی وسعتِ علمی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے جب کہ دوسری طرف یہ تلمیحات وسیع تر معانی کا ابلاغ بھی کرتی ہیں۔

۳.۳ علمِ عروض

علمِ بیان اور علمِ بدیع کے بعد شاعری کا تیسرا بڑا جزو علمِ عروض ہے جس میں شاعر مختلف قسم کی بحروں کا استعمال کرتے ہوئے اپنے کلام میں ایک خاص طرز کی روانی اور موسیقیت پیدا کرتا ہے۔ علمِ عروض میں بنیادی چیز وزن اور بحر ہی ہوتی ہے جس کی بدولت شاعری کو نثر سے منفرد سمجھا جاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں عروض وہ علم ہے جس کے ذریعے شعر کے وزن کی پرکھ یا جانچ پڑتال

کی جاتی ہے۔ شعر تخلیق کرنے اور پرکھنے کے لیے علمِ عروض کے مقررہ قاعدوں سے واقفیت ایک بنیادی امر ہے۔ اس علم کی ابتدا خلیل بن احمد عروضی نے کی۔ شعر کے وزن کی جانچ پڑتال اور پرکھ کے لیے مختلف بحریں ایجاد کیں اور "ف،ع،ل" کو مادہ قرار دے کر حرف کی حرکات و سکنات سے شعر کے لیے مختلف اوزان مقرر کیے۔ علمِ عروض کی توضیح ابوالاعجاز حفیظ صدیقی مختصر مگر جامع انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

> "علما نے وزن شعر کی صحت و سقم کو جاننے کے لیے چند قاعدے وضع کیے ہیں جن کے مجموعے کو عروض کہا جاتا ہے۔ علمِ عروض کا موجد خلیل بن احمد بصری (متوفی ۱۷۵ہجری) ہے۔ ہندی عروض کو پنگل کہا جاتا ہے۔" (۱۱۵)

علمِ عروض سے واقفیت رکھنے والوں میں سے بعض نے عروضی اصطلاحات کے انبار لگا دیے ہیں اور اس کا مذاق اڑانا تو فیشن بن چکا ہے۔ عہدِ حاضر کے نقادوں نے علمِ عروض کے مقام کو حقیر بنا دیا ہے۔ باوجود اس کے، شعرا نے اس علم کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ وہ اس علم کے ذریعے ہی اپنے کلام کو مقررہ قاعدوں کے مطابق تخلیق کر رہے ہیں۔ ان شعرا میں ایک اہم اضافہ احمد حسین مجاہد بھی ہیں جو اس علم سے مکمل طور پر آگاہ ہیں۔ ذیل میں ان کا مختصر جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

۳.۴ مترنم بحریں

احمد حسین مجاہد کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے راقم اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ان کی شاعری تمام فنی خصائص سے بھرپور ہے جس میں علمِ عروض کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں تمام مروج بحروں کا استعمال کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کا کلام غنائیت کے ساتھ ساتھ صوتی اثرات کا حامل ہے۔ ان کی شاعری میں مرکب بحریں اور مفرد بحریں عروضی وقفہ و غنائیت کا

باعظ بنتی ہیں، جنھیں بآسانی روانی و ترنم سے گنگنایا جا سکتا ہے۔ ان کی مستعمل بحروں کے حوالے سے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

تشکیل خدوخالِ انا عشق سے ہوئی
ہستی فنا کے غم سے ورا عشق سے ہوئی (۱۱۶)

یہ شعر "بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف مخذوف" میں لکھا گیا ہے جس کے ارکان "مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن ہیں۔ اس کے علاوہ "بحر مجتث مثمن مخبون مخذوف" پر ایک شعر دیکھیے:

سب سے الگ تھا سب سے جدا تھا مری طرح
اچھا تھا وہ بہت، سو برا تھا مری طرح (۱۱۷)
مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن

اسی بحر میں ایک اور غزل ملاحظہ کریں:

انا کی سخت چٹانوں میں راستہ کر کے
کیا ہے ایک خلا ختم دوسرا کر کے (۱۱۸)

احمد حسین مجاہد کی عروضی پختگی کا اندازہ درج ذیل شعر سے لگایا جا سکتا ہے جو شعر کو ایک خاص ترنم اور غنائی وقفہ عطا کیے ہوئے ہے:

زندگی کم ہو رہی ہے عمر بڑھتی جا رہی ہے
لحہ لحہ کی چادر سکڑتی جا رہی ہے (۱۱۹)
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن

مندرجہ بالا شعر "بحر رمل مثمن سالم" میں برتا گیا ہے جس کے ارکان "فاعلاتن" ہیں۔ اس کے علاوہ احمد حسین مجاہد کے کلام میں دیگر بحروں کا استعمال بھی اہمیت رکھتا ہے۔ جن میں رمل مسدس سالم، رمل مسدس مخذوف اور رمل مثمن مخذوف اہم ہیں۔ ان کے کلام کی ایک اہم بحر "بحر

ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف" ہے جن کے ارکان "مفعول معاعلن فعولن" ہیں۔ یہ مرکب بحر ہے جس سے ان کے کلام میں روانی اور موسیقیت کے تاثرات نمایاں نظر آتے ہیں:

کیسی یہ ہوا چلی ہے

مجھ میں بھی دراڑ آگئی ہے (۱۲۰)

تلوار عدو کی تھک گئی ہے

پھر فصل سروں کی پک گئی ہے (۱۲۱)

مفعول مفاعلن فعولن

احمد حسین مجاہد کی چند غزلیات "بحر رجز مثمن مطوی مخبون" میں بڑی دل کش معلوم ہوتی ہیں۔ اس بحر کی غزل کا ایک مطلع ملاحظہ کیجیے:

اس کا نیاز مند ہوں اپنی مجال کے نثار

جس کا کوئی بدل نہیں ایسی مثال کے نثار (۱۲۲)

مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن

مندرجہ بالا تما بحروں میں ایک اہم بحر "بحر متقارب مسدس محذوف" احمد حسین مجاہد کے کلام کی روح معلوم ہوتی ہے۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

سب جذبوں کی شدت کے بیوپاری نکلے

سیدھے سچے لوگ بھی کاروباری نکلے (۱۲۳)

فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن

بحر متقارب مسدس مضاعف سے بھی ایک شعر دیکھیے:

تھوڑی دیر کو برف پہ سورج چمکا تھا
دریا میرے آنگن تک آپہنچا تھا (۱۲۴)
فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن

مندرجہ بالا مثالیں اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ احمد حسین مجاہد علمِ عروض پہ نہ صرف مکمل دسترس رکھتے ہیں بلکہ انھوں نے غزل کی مروجہ بحروں کے علاوہ بھی چند ایک غزلوں کے ارکان کو کم یا زیادہ کر کے نت نئے تجربات بھی کیے ہیں۔ احمد حسین مجاہد کے دونوں مجموعات میں اکانوے (۹۱) غزلیات مختلف بحروں کے مختلف ارکان میں لکھی گئی ہیں جو ان کے فن کا پختہ اور واضح ثبوت ہیں۔

۳.۵ موسیقیت

علمِ عروض سے مکمل شناسائی شاعری کو موسیقیت عطا کرتی ہے۔ ترنم، نغمگیت اور موسیقیت کسی بھی شاعر کے انداز کی جمالیاتی صفات ہیں۔ جب شاعری میں غنائیت اور ترنم ہو گا تو وہ جادو اثر خصوصیات کی حامل ہو جاتی ہے۔ شاعر علمِ عروض کے تمام مروجہ ارکان و قواعد کو سلیقے سے برتتا ہے تو پھر وزن اور بحر کے مکمل ہونے پر شاعری میں موسیقیت پیدا ہوتی ہے۔ ان قواعد میں بنیادی شے قافیے و ردیف کی بندش اور الفاظ کا صوتی آہنگ اپنا وجود برقرار رکھتے ہوئے کلام میں مٹھاس اور شیرینی گھولتی ہے اور پھر وہ شاعری بآسانی ہر خاص و عام کی زدِ زبان چڑھ کر اپنی حقیقت کی راہیں نکالتی ہے جس کی بدولت غزل یا نظم کا ہر شعر مکمل دھن اور سُر پیدا کرتا ہے۔

احمد حسین مجاہد کا کلام بھی موسیقیت، ترنم اور غنائیت سے بھرپور ہے۔ وہ بحر کے انتخاب کو پیشِ نظر رکھ کر کلام کے فطری ماحول کو مترنم رکھنے اور شیریں اصوات کی تکرار کو برقرار رکھنے کا

ہنر جانتے ہیں۔ چھوٹی بڑی متعدد بحروں کے استعمال سے ان کا کلام نغمگیت اور موسیقیت کی عکاسی کرتا ہے۔ مختصر بحر پر مشتمل چند اشعار دیکھیے:

خزاں مہمان ہے شاید
ابھی امکان ہے! شاید!
جھپکتا کیوں نہیں پلکیں
یہ بُت حیران ہے شاید
سڑک پر میں اکیلا ہوں
نگر ویران ہے شاید (۱۲۵)

اس کے علاوہ ایک اور غزل جو چھوٹی بحر میں لکھی گئی ہے۔ موسیقیت اور صوتی حسن میں اپنی مثال آپ ہے۔ جیسے:

تلوار عدو کی تھک گئی ہے
پھر فصل سروں کی پک گئی ہے
موسم ہے مری نمو کا شاید
پلکوں پہ نمی چٹک گئی ہے (۱۲۶)

احمد حسین مجاہد جس طرح چھوٹی بحروں کو چابک دستی سے پیش کرتے ہیں وہاں لمبی و طویل بحروں کا استعمال بھی ان کی شاعری میں فطری سُر اور دھن بھی پیدا کرتا ہے۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

میں ہوں کن فکاں کے ضمیر میں مری واردات میں عشق ہے
میرے قول و فعل ہیں ایک سے مری شش جہات میں عشق ہے
کسی معجزے کے ہیں منتظر جو روائتوں کے اسیر ہیں
مری زندگی ترے غم سے ہے مری کائنات میں عشق ہے (۱۲۷)

تمہارے غم سے وابستہ ہوں یہ راحت بہت ہے
زوالِ عمر کے اس عشق میں شدت بہت ہے (۱۲۸)
پلٹ پلٹ کے مجھے دیکھتا تھا جاتے ہوئے
میں اس سے روٹھ گیا تھا اُسے مناتے ہوئے (۱۲۹)

مندرجہ بالا اشعار موسیقت اور نغمگیت کے حوالے سے تاثراتی صوتی ہم آہنگ اور الفاظ کی تکرار کی خوب صورتی کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ پڑھنے والے کو احمد حسین مجاہد کا کلام ترنم اور سوزوساز کے تمام احساسات ابھارتا ہے اور نغمگی محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اشعار کو روانی میں گاتا جاتا ہے۔

۳.۶ منظر نگاری

یہ ایک ادبی اصطلاح ہے جو شاعری اور نثر دونوں میں مستعمل ہے جس میں شاعر، ادیب یا مصنف الفاظ کے ذریعے نقشہ کھینچتا اور بیان کرتا ہے۔ کوئی بھی فن کار اپنے فنی جوہر دکھاتے ہوئے کسی خیال، ذہنی حالت یا کسی حسیاتی تجربے کو زبان بخشتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ زبان محض الفاظ کی صورت میں سامنے آئیں بلکہ اس کا اظہار مختلف رنگوں اور نشانات کے ذریعے بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک ایسا اظہار ہوتا ہے کہ لکھنے والا اس طرح زبان وبیان کا استعمال کرتا ہے کہ پڑھنے والا جب پڑھتا ہے تو وہ پورے کا پورا نقشہ قاری کے ذہن پر مرتسم ہو جاتا ہے۔ گویا ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے مطالعہ کرنے والا خود بھی اس منظر کا حصہ ہو۔ یہ منظر نگاری "ساکن" اشیا پر بھی کی جاتی ہے اور "حرکت" پر بھی۔ شاعر یا ادیب تخیلاتی امور سے کام لیتے ہوئے تمام تخلیق جوہر، طلسماتی فضا اور فکر و جذبے کی آمیزش سے الفاظ کا انتخاب کرتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سید عابد علی عابد کہتے ہیں:

"تصویریت میں جو کچھ فن کار کو کہنا ہے وہ تمثالوں اور پیکروں کے

ذریعے یعنی تصویروں کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ فکر
اور جذبے کی آمیزش جوں کی توں موجود ہوتی ہے لیکن کیفیت
مطلوب کا انتقال بصری راستوں سے ہوتا ہے۔"(۱۳۰)

کوئی ادیب یا شاعر اپنی تحریروں کو جس قدر حسِ بصارت کے ذریعے پیش کرنے کی صلاحیت رکھے گا، اس قدر وہ تحریریں منظر نگاری جیسے پہلو سے بھرپور ہوں گی۔ احمد حسین مجاہد کی شاعری اس لیے اہمیت کی حامل ہے۔ چوں کہ وہ جس طرح الفاظ کے ذریعے کسی چیز کا نقشہ کھینچتے ہیں کم ہی کسی دوسرے ہم عصر کی تحریروں میں ہو۔ اس ضمن میں چند منتخب اشعار ملاحظہ فرمایئے:

تھوڑی دیر کو برف پہ سورج چمکا تھا
دریا میرے آنگن تک آ پہنچا تھا
نیم دلی سے دستک دی تھی میں نے بھی
اس نے بھی دروازہ آدھا کھولا تھا (۱۳۱)

اب سوچتا ہوں میں کسی صحرا میں تو نہ تھا
کتنے گھنے درخت تھے قرب و جوار میں
پھر کس لیے میں اپنے خوابوں سے کٹ گیا
آکاس بیل بن کے میں خود سے لپٹ گیا (۱۳۲)

مندرجہ بالا اشعار میں احمد حسین مجاہد نے تشبیہات و استعارات کا استعمال کر کے کلام میں لفظوں کے ذریعے تصویر کشی کی ہے جیسے زمین پر سفید برف کا پڑنا اور اس پر سورج کا چمکنا، جس کے سبب برف پگھلتی ہوئی دریا میں امڈ آتی ہے اور طغیانی کا سبب بنتی ہے۔ اسی طرح نیم دلی سے دستک دینا اور جواباً کسی کا آدھا دروازہ کھلنا ایک پُر فضا ماحول سامنے آتا ہے۔ اگلے اشعار میں بھی یہ منظر نگاری دیکھی جا سکتی ہے کہ صحرا میں تنِ تنہا ہونا اور آس پاس محض گھنے درختوں کا موجود ہونا اور پھر

آخر کار آکاس بیل بن کر درختوں سے لپٹنے کے بجائے خود سے لپٹنا، کہ تمام تر عناصر منظر نگاری ہیں۔ جیسے پڑھتے اور سنتے ہی فوراً پورا منظر ذہن اور آنکھوں میں سرایت کر جاتا ہے۔ ایک اور جگہ احمد حسین مجاہد کچھ یوں محاکات نگاری سے کام لیتے ہیں:

مریخ آ گیا تھا زمیں کے بہت قریب
وہ اپنے گھر کی چھت پہ بڑی دیر تک رہی
میں بادلوں کی اوٹ سے تکتا رہا اسے
وارفتگی میں وہ بھی کھڑی دیر تک رہی (۱۳۳)

یوں ہی نہیں یہ پرندے فضا میں ٹھہرے ہوئے
کسی کو دیکھ لیا ہو گا مسکراتے ہوئے (۱۳۴)

جھٹک کر ڈالتی ہے جب وہ بھیگے بال شانوں پر
تو نیچے دور وادی میں کہیں دریا چمکتا ہے (۱۳۵)

مندرجہ بالا اشعار میں شاعر نے کس قدر جمالیاتی تاثرات کو بیان کیا ہے، جس کو پڑھتے ہی ہر انسان کے ذہن میں ایک منظر جنم لیتا ہے۔ یہ شاعر کے قلم کا کمال ہے کہ وہ دیہات اور شہر کی منظر نگاری کو جس طرح پیش کرتے ہیں بالکل اسی طرح ذائقے، خوشبو، نغمگی اور لمس جیسے عناصر کو بھی تصویری شکل دیتے ہیں۔ جیسے:

کچھ ایسے آسماں مرے شانے پہ آ گیا
اندھے کا پاؤں جیسے خزانے پہ آگیا
میں زندگی کے گہرے سمندر میں تیر کر
اندھے کنویں کے تنگ دہانے پہ آگیا (۱۳۶)

چمن تک نا رسائی کے الم کا کوئی سامع ہو

تو نغمہ بن کے یہ زنجیر کی جھنکار میں آئے (۱۳۷)

مندرجہ بالا تمام اشعار کی روشنی میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ احمد حسین مجاہد لفظوں کے ذریعے کسی بھی منظر کو پیش کرنے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ وہ جس طرح چاہتے ہیں اس سے بڑھ کر کہیں وہ قارئین کے دلوں کو جی لیتے ہیں۔ قاری خود بھی اس بات کا احساس کرتا ہے کہ شاعر نے جس قدر امیجری سے کام لے کر الفاظ کو عملی جامہ پہنایا، شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے کلام میں یہ جمالیاتی عنصر موجود ہو۔ اس لیے احمد حسین مجاہد جس طرح چاہتے ہیں لفظی تصویر کشی کے ذریعے قارئین تک اپنی بات پہنچا دینے کا جوہر و فن جانتے ہیں جو ان کی بالغ شعوری کا واضح ثبوت ہے۔

۳.۷ کلاسیکی رنگ

کلاسیکی لفظ "کلاسک" سے ماخوذ ہے۔ لغوی معنوں میں کلاسک سے مراد "ادب عالیہ"، "مستند" اور "ٹکسالی" کے ہیں۔ اصطلاحی معنی میں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ادب جو ہر عام و خاص میں مشہور و معروف ہو اور جس کی اہمیت سے ہر کس و ناکس واقف ہو۔ ایسا ادب جس کا اسلوب اور زبان و بیان واضح ہو اور دیگر تمام شعرا و ادبا کے فن پاروں سے منفرد ہو۔ کلاسیکی شعرا میں میر تقی میرؔ، خواجہ میر دردؔ، مرزا رفیع سوداؔ، مومن خان مومنؔ، غالبؔ اور داغؔ دہلوی کے نام سرِ فہرست ہیں۔ ان شعرا کے فن پارے فصیح و بلیغ اور مستند و ٹکسالی معیار کے عین مطابق ہیں۔

جدید شعرا کے ہاں یہ اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ چوں کہ ان شعرا نے کلاسیکی شعرا کا اثر قبول کیا اور اپنے کلام میں کچھ ایسے عناصر شامل کیے جو قدیم شعرا کے ہاں پہلے سے موجود تھے۔ عہدِ حاضر

میں بھی شعرا اس رنگ کو اپنی شاعری میں بھر کر اس روایت کو زندہ رکھا ہے۔

ان شعرا میں احمد حسین مجاہد بھی اس صف میں کھڑے نظر آتے ہیں کہ جن کے کلام میں کلاسیکی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ علی الاعلان اس بات کی دلیل دیتے ہیں کہ وہ کلاسیکی شعرا سے بے حد متاثر ہیں اور اس ضمن میں کہہ اٹھتے ہیں:

اقبالؔ کے افکار سے سرشار ہوں میں
اور میرؔ کے لہجے کا پرستار ہوں میں
اسلوب، سخن میں ہے مرا اپنا ہی
یہ سچ ہے کہ غالبؔ کا طرف دار ہوں میں (۱۳۸)

ان اشعار سے عیاں ہوتا ہے کہ احمد حسین جاہد کے کلام میں اقبالؔ کے افکار ہیں، میرؔ کا لب و لہجہ اور غالبؔ کی طرف داری موجود ہے۔ مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کی طرف داری سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مجاہد کے ہاں غالبؔ کے طرز کا ہی اندازِ بیان پایا جاتا ہے کہ جیسے:

روز آرزو کوئی مرے دل میں مرتی ہے
تُو نہیں سمجھ سکتا مجھ پہ کیا گزرتی ہے
حال پوچھنے والے اب میں کیا کہوں تجھ سے
سانس لے رہا ہوں میں زندگی گزرتی ہے (۱۳۹)

احمد حسین مجاہد کلاسیکی شعرا میں سب سے زیادہ غالبؔ سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ جس طرح ان شعرا میں غالبؔ کے اسلوبِ بیان کو پیش کیا ہے۔ غالبؔ کے ہاں "روز مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی" جب کہ احمد حسین مجاہد کے "روز آرزو کوئی میرے دل میں مرتی ہے" دونوں معانی و مفہوم ملتے جلتے اور قریب قریب ہیں۔ ایک مقام پر تو مجاہد، غالبؔ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ان کی عظمت کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

گرہ کشائی اسرارِ کائنات میں گم
ورائے حدِ بیاں حسن کی صفات میں گم
صریر خامہ نوائے سروش ہو جائے
خیال اس کے طلسم بیاں میں کھو جائے
حصولِ منصب و رتبہ نہ تھا شعار اس کا
قلندروں کا سلیقہ تھا افتخار اس کا
جو بادشاہ تھے اس شخص کے غلام ہوئے
مقام اس کی تمنا میں بےمقام ہوئے (۱۴۰)

اس کے بعد احمد حسین مجاہد یوں کہتے ہیں:

کھاتا ہوں جھوٹے لقمے غالبؔ کی شاعری کے
میری گزر بسر ہے احمد لیے دیے پر (۱۴۱)

احمد حسین مجاہد کا کلاسیکی رنگ ان کی چند غزلیات میں دیکھا جا سکتا ہے جن میں انھوں نے خصوصاً غالبؔ کی زمین میں کہے ہوئے اشعار میں کچھ نیا تخلیق کر کے اس روایت کو پھر سے زندہ جاوید کر دیا ہے۔ غالبؔ کے ہاں "وہ لفظ کہ غالب جو مرے اشعار میں آوے" مگر یہی اندازِ بیان مجاہد کے ہاں کچھ یوں ہے:

سکوتِ شب ہو یوں گویا کہ جاں بیمار میں آئے
لہو بہرِ سماعت دیدۂ بیدار میں آئے
کہاں صورت گری ممکن ہے خوابِ وصل کی احمدؔ
یہی کافی ہے اس کا تذکرہ اشعار میں آئے (۱۴۲)

اس کے علاوہ بھی احمد حسین مجاہد کے کلام میں میر تقی میرؔ کا لب ولہجہ بولتا ہوا سنائی دیتا ہے۔

جیسے:

اٹھ جاؤں گا میں لے کے ہنر دربدری کا
رہ جائے گا بس نام ہی آشفتہ سری کا
میں اپنے لرزتے ہوئے سائے کی لحد ہوں
دم آنکھوں میں اٹکا ہے چراغِ سحری کا (۱۴۳)

مندرجہ بالا تمام فن پاروں میں احمد حسین مجاہد کا کاسیکی رنگ جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جس طرح انھوں نے کلاسیکی شعرا کی زبان و بیان اور انداز کو برتا ہے اسی طرح ساتھ ساتھ وہ جدید شعرا کے کلام سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ ان شعرا میں پروین شاکرؔ اور احمد فرازؔ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ احمد فرازؔ کو خراجِ تحسین کچھ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

صدف میں گہر تو کہیں دیکھنا
جو ہم دیکھتے ہیں نہیں دیکھنا
ریا کا کوئی داغ دھبہ نہیں
کبھی ملحدوں کی جبیں دیکھنا
اس انجان رستے میں کوئی اگر
بلائے تو مڑ کر نہیں دیکھنا (۱۴۴)

کلاسیکی شعرا کے کلام کو اور شخصیت کو اگر جانچنا ہو تو احمد حسین مجاہد کے کلام کو پڑھنا ہوگا۔ کیں کہ ان کے کلام میں اُن شعرا کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔ ایک طرف تو مجاہد نے کلاسیکی روایت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا تو دوسری طرف جدید رنگ بھی ان کے کلام میں پیوست ہے۔

مندرجہ بالا تمام فنی خصائص کے مطالعے سے راقم اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ احمد حسین مجاہد کا کلام تمام تر فنی محاسن سے بھرپور ہے۔ جیسے ایک شاعر کو لطیف پیرائے کا استعمال کر کے شیرنی اور

مٹھاس گھولنی پڑتی ہے، بعینہٖ مجاہد کا کلام بھی اس حوالے سے پیش پیش ہے۔ علمِ بیان، علمِ بدیع اور علمِ عروض کے تمام قواعد اور ضوابط پر ان کی شاعری پورا اترتی ہے۔ جہاں جس لفظ کا چناؤ کرتے ہیں اور پھر اسے فن کے قالب میں چاہتے ہیں ڈھالتے ہیں۔ اس لیے یہ استعمال اور چناؤ منفرد اور واضح نظر آتا ہے۔ علمِ بیان و بدیع و عروض پر مکمل دسترس رکھنے کی بدولت ان کا کلام نقطۂ عروج پر ہے۔ ان کے کلام میں جدت و ندرت، زبان کی سلاست اور تاثیر کے عناصر کے ساتھ ساتھ بیان کی تازگی ملتی ہے جس سے قاری نہ صرف متاثر ہوتا ہے بلکہ اپنی جاذبیت کی بدولت اسے مدہوش بھی کرتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ پروفیسر ڈاکٹر فاروق چوہدری، رموزِ اُردو ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص۱۲۷۔۱۲۸

۲۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، اصنافِ نظم و نثر، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص۳۳

۳۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص۱۱۵

۴۔ ایضاً، ص۷۹

۵۔ ایضاً، ص۴۸

۶۔ ایضاً، ص۲۷

۷۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، عکاس پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص۴۵

۸۔ ایضاً، ص۴۷

۹۔ ایضاً، ص۹۲

۱۰۔ ایضاً، ص۱۱۲

۱۱۔ ایضاً، ص۱۳۷

۱۲۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص۱۰۳

۱۳۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۱۱۵

۱۴۔ ایضاً، ص۱۲۷

۱۵۔ ایضاً، ص۱۳۷

۱۶۔ ایضاً، ص۱۵۹

۱۷۔ ڈاکٹر ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد،۲۰۱۸ء، ص۲۵

۱۸۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص۲۷

۱۹۔ ایضاً، ص۵۳

۲۰۔ ایضاً، ص۶۳

۲۱۔ ایضاً، ص۶۶

۲۲۔ ایضاً، ص۱۰۷۔۱۰۸

۲۳۔ ایضاً، ص۱۱۶

۲۴۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۸۹

۲۵۔ ایضاً، ص۱۱۲

۲۶۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص۱۰۳

۲۷۔ ایضاً، ص۱۱۸

۲۸۔ ایضاً، ص۹۳

۲۹۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۶۷

۳۰۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، اصنافِ نظم و نثر، ص۳۴

۳۱۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص۲۷

۳۲۔ ایضاً، ص۲۶

۳۳۔ ایضاً، ص۵۳

۳۴۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۴۶

۳۵۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۱۳۱

۳۶۔ ایضاً، ص۹۸

۳۷۔ ایضاً، ص۱۳۲

۳۸۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص۲۹

۳۹۔ ایضاً، ص۴۵

۴۰۔ ایضاً، ص۱۰۵

۴۱۔ ایضاً، ص۳۱

۴۲۔ ایضاً، ص۳۴

۴۳۔ ایضاً، ص۸۲

۴۴۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۳۳

۴۵۔ ایضاً، ص۱۲۹

۴۵۔ ایضاً، ص۲۵

۴۷۔ ایضاً، ص۵۲

۴۸۔ ایضاً، ص۱۵۵

۴۹۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص۳۲

۵۰۔ ایضاً، ص۴۶

۵۱۔ ایضاً، ص۶۲

۵۲۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، کلیدِ اُردو، کاروان بک ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص۲۹۷

۵۳۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۱۵۴

۵۴۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص ۱۵۲

۵۵۔ ایضاً، ص ۳۰

۵۶۔ ایضاً، ص ۴۶

۵۷۔ احمد حسی۱۱۶ان مجاہد، اوک میں آگ، ص

۵۸۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۵۹۔ ایضاً، ص ۹۶

۶۰۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص ۱۳۵

۶۱۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص ۲۷

۶۲۔ پروفیسر ڈاکٹر فاروق چوہدری، رموزِ اُردو، ص ۱۳۵

۶۳۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص ۶۷

۶۴۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۶۵۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۶۶۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص ۱۴۴

۶۷۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۶۸۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۶۹۔ ایضاً، ص ۸۵

۷۰۔ پروفیسر حمید اللہ ہاشمی، بدیع و بیان، مکتبہ دانیال، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۷۳

۷۱۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص ۲۵

۷۲۔ ایضاً، ص ۴۳

۷۳۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص۴۶

۷۴۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۳۳

۷۵۔ ایضاً، ص۳۵

۷۶۔ ایضاً، ص۴۷

۷۷۔ پروفیسر ڈاکٹر فاروق چوہدری، رموزِ اُردو، ص۱۳۷

۷۸۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص۱۱۶۷

۷۹۔ ایضاً، ص۸۹

۸۰۔ ایضاً، ص۸۶

۸۱۔ ایضاً، ص۶۵

۸۲۔ ایضاً، ص۶۱

۸۳۔ ایضاً، ص۵۴

۸۴۔ ایضاً، ص۴۲

۸۵۔ پروفیسر ڈاکٹر فاروق چوہدری، رموزِ اُردو، ص۱۴۲

۸۶۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۴۵

۸۷۔ ایضاً، ص۴۸

۸۸۔ ایضاً، ص۵۳

۸۹۔ ایضاً، ص۸۶

۹۰۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص۱۱۷

۹۱۔ ایضاً، ص۱۱۴

۹۲۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص ۹۳

۹۳۔ ایضاً، ص ۴۶

۹۴۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، کلیدِ اُردو، ص ۳۰۹

۹۵۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص ۱۱۳

۹۶۔ اثرؔ لکھنوی، کلیاتِ اثرؔ، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی، س ن، ص ۲۳۲

۹۷۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص ۲۰

۹۷۔ ڈاکٹر صابر کلوروی، بدیع و بیان، مکتبہ دانیال، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۷۳

۹۹۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص ۴۷۔۴۸

۱۰۰۔ ایضاً، ص ۵۴

۱۰۱۔ ایضاً، ص ۸۹۔۹۰

۱۰۲۔ ایضاً، ص ۱۵۹

۱۰۳۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص ۱۱۳

۱۰۴۔ ایضاً، ص ۹۴

۱۰۵۔ ایضاً، ص ۲۱

۱۰۶۔ ڈاکٹر ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ص ۲۷۔۳۷

۱۰۷۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص ۳۴

۱۰۸۔ ایضاً، ص ۵۰

۱۰۹۔ ایضاً، ص ۱۲۹

۱۱۰۔ ایضاً، ص ۲۴

۱۱۱۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص۱۰۵

۱۱۲۔ ایضاً، ص۹۴

۱۱۳۔ ایضاً، ص۵۳

۱۱۴۔ ایضاً، ص۲۳۔۲۴

۱۱۵۔ ڈاکٹر ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ص۱۶۹

۱۱۶۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۶۵

۱۱۷۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص۴۹

۱۱۸۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۳۱

۱۱۹۔ ایضاً، ص۹۵

۱۲۰۔ ایضاً، ص۱۱۳

۱۲۱۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص۶۶

۱۲۲۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۷۴

۱۲۳۔ ایضاً، ص۹۱

۱۲۴۔ ایضاً، ص۲۹

۱۲۵۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص۱۰۳

۱۲۶۔ ایضاً، ص۶۶

۱۲۷۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۱۱۵

۱۲۸۔ ایضاً، ص۳۷

۱۲۹۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص۸۵

۱۳۰۔ سید عابد علی عابد، اسلوب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص۲۰۰

۱۳۱۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۲۹

۱۳۲۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۵۹

۱۳۳۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص۱۱۲

۱۳۴۔ ایضاً، ص۸۵

۱۳۵۔ ایضاً، ص۴۸

۱۳۶۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۴۵۔۴۶

۱۳۷۔ ایضاً، ص۱۳۸

۱۳۸۔ ایضاً، ص۲۴

۱۳۹۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۵۱۔۵۲

۱۴۰۔ ایضاً، ص۹۹

۱۴۱۔ ایضاً، ص۱۰۸

۱۴۲۔ ایضاً، ص۱۳۸

۱۴۳۔ احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، ص۳۱

۱۴۴۔ احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، ص۱۰۵۔۱۰۶

باب چہارم

حاصلِ تحقیق

گزشتہ ابواب بندی کے نتیجے میں راقم اس منزل پر پہنچا ہے کہ جس طرح اُردو ادب کا سوتا پھوٹا اور پھوٹتے ہی ہر طرف پھیل گیا۔ اس چشمے سے نہ صرف نئے نئے چشمے جاری و ساری ہوئے بلکہ اس کی آب یاری ہر خاص و عام نے کی۔ ابتدا میں تو یہ صرف بول چال تک محدود رہا مگر رفتہ رفتہ اس میں ترقی آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی حدیں وسیع ہوتی گئیں۔

اُردو ادب کی ترقی میں سب سے پہلے شمالی ہند اور جنوبی ہند نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کے بعد دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ نے اس روایت کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس کہ کی جدت وندرت میں اضافہ بھی کیا۔ زبان و ادب کے اس قافلے نے زبان اور ادب دونوں کو متنوع جہت سے روشناس بھی کیا اور ہر طرح کے موضوعات کو برتا۔ ان موضوعات میں نہ صرف عشق مجازی بلکہ عشقِ حقیقی اور تصوف جیسے عناصر کو بھی شامل کی اگیا۔ دوسری طرف اس کے مقابلے میں داستان اُردوناول جیسی اصناف تخلیق کی جارہی تھیں، جس میں ہر طرکے ح فکری وفنی عناصر کو خوب صورتی سے برتا گیا۔ اس ضمن میں سب سے اول تحریک کا آغاز فورٹ ولیم کالج سے ہوا، جس کے ذریعے باقاعدگی سے تخلیق کاروں نے نئ نئ تخلیقات کیں اور اُردو زبان و ادب کو دوام بخشا۔ اس کالج کے بعد مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کے خطوط نثری تاریخ میں اہمیت کے حامل ہیں اور ان کی شاعری سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

سرسید احمد کی تحریک نے اُردو زبان وادب کے لیے نت نئ راہوں کا تعین کر کے اس کی تعمیر و ترقی میں مثبت اقدامات سے متعارف کیا اور ان کے رفقا نے مل کر اُردو ادب کو نئ اصناف سے متعارف کیا اور نئے موضوعات کو پیش کر کے کلاسیکی ادب کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں جدت کی۔ اس تحریک نے سماج اور سماج کے اردگرد کے حالات و واقعات کو اپنا موضوع بنایا اور زندگی کے حقائق کو بیان کیا۔ سرسید کی اس تحریک نے نئے لکھاری پیدا کیے اور ادب کو ادب برائے

ادب کے بجائے ادب برائے زندگی کا قائل کیا۔

بعد ازاں انجمن پنجاب اور ترقی پسند تحریک نے ان روایات کو بحال رکھا اور ادب برائے زندگی کے راستے پر چل کر معاشی، سماجی اور سیاسی استحصال کو زیرِ کرنے کے لیے عملی اقدامات کیے۔ اس سلسلے میں ان تحریکوں کے افراد کو کئی مشکلات سے بھی گزرنا پڑا اور قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔

بالآخر حلقہ اربابِ ذوق نے ایک بار پھر سے ادب کو ادب برائے ادب کی طرف راغب کر دیا مگر اس حقیقت سے کبھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُردو ادب کی تمام تحریکوں اور دبستانوں سے زبان و ادب کی جنم بھومی میں ترقی و وسعت ہوئی۔

عصرِ حاضر میں بڑھتے ہوئے مسائل اور جدید ٹیکنالوجی کے استعمال نے ہر طرف انتشار پھیلا رکھا ہے جس کے باعث نئے لکھاریوں نے اس دور و زمانے کے متعلق نئے اور اچھوتے مضامین کو اپنا موضوعِ سخن بنا کر پیش کیا ہے جس میں نہ صرف زمانے کے مسائل کا بیان ملتا ہے بلکہ اس دور کی تاریخ، تہذیب و ثقافت اور دیگر رسومات کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔

دورِ حاضر کے ان شعرا میں ایک اہم نام احمد حسین مجاہد کا بھی ہے جن کی شاعری متنوع پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہے۔ گزشتہ ابواب کے مطالعہ کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شاعری فکر و فن سے بھرپور ہے۔ مختلف الفاظ کے مختلف انتخاب سے اپنے کلام میں رنگ بھرتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی ذات کے ساتھ ساتھ دنیا کی بے ثباتی اور اس میں پیش آنے والے مسائل کو اپنا موضوعِ کلام بناتے ہیں۔ احمد حسین مجاہد کے کلام میں کائنات کے متعلق ایک ارفع سوچ کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ان جھلکیوں میں شعور وادراک، عصری شعور، سیاسی شعور، سماجی و معاشی استحصال، طبقاتی کش مکش اور سماجی مسائل کا بیان ملتا ہے۔ ساتھ ساتھ مجاہد کا ذاتی استغنا، حسن و عشق، ہجر و

وصال، رجائیت اور رومانویت جیسے عناصر کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ غزل کی روایت کو برقرار رکھا مگر تشبیہات و استعارات کو نئے زاویوں سے پیش کیا۔

احمد حسین مجاہد ایک خوگو اور خوش فکر شاعر ہیں۔ الفاظ کے ذریعے شیرینی و لطافت گھولتے جاتے ہیں۔ وہ ندرت خیال اور خلوصِ دل سے موضوعات کو برتتے ہیں۔ جب بھی کسی موضوع کو لکھتے ہیں تو اس میں خندہ پیشانی سے اور خوش گوئی سے تخلیق کرتے ہیں۔ غزل میں ان کا بنیادی موضوع عشق ہی ہے۔ یہ وہ عشق ہے جو اذانِ بلال میں جھلکتا ہے، وہ عشق ہے جو خلقِ خدا کو فرماں بردار بناتا ہے، یہی وہ عشق ہے جس میں شاعر عشقِ مجازی کے راستوں پر چلتے ہوئے عشقِ حقیقی کی وسعتوں کو پالیتا ہے۔

احمد حسین مجاہد کا کلام مختلف شعری علامتوں کے نئے نئے معنی و مفاہیم دریافت کرتا ہے۔ ان علامتوں میں "آگ" اور "چراغ" کو نئے معنوں میں استعاراتی انداز اپنا کر پیش کرتے ہیں۔ لفظوں کے ہیر پھیر اور الٹ پلٹ سے نئی نئی کیفیات جنم لیتی ہیں۔

احمد حسین مجاہد کی شاعری مختلف رنگوں کی آمیزش لیے ہوئے ہے۔ ان کا کلام جہاں فکری رجحانات سے بھرپور ہے وہاں ساتھ ساتھ جذباتی، جمالیاتی اور تاثراتی رنگ بھی نمایاں ہے۔ ان کے کلام کی بنیادی خصوصیت فکری جذبے کی موجودگی ہے جس کے ذریعے وہ مخلوقِ خدا جس میں پسا ہوا اور مفلس طبقے کے جذبات ابھارتے ہیں اور ان میں ہر طرح کا شعور لانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ علامات و اشارات اور رمز و کنایہ کی مدد سے جذبے کو خارجی زندگی سے پیوست کرتے نظر آتے ہیں۔

احمد حسین مجاہد کی تمام تحریروں میں جذبے کی فراوانی، انسانی ہمدردی اور شعور و ادراک رکھنے والے عناصر موجود ہیں۔ وہ سماج کے دکھ درد کو بآسانی سمجھتے ہیں۔ اسی لیے ان کی غزل دلی

جذبات کی بھرپور آئینہ دار ہے۔ وہ اپنے ذاتی استغنا کے علاوہ معاشرے کے تمام حالات وواقعات کو حق اور سچ سے بیان کرتے ہیں۔ معاشرے میں رونما ہونے والے مسائل جن میں جاگیر دارانہ نظام، طبقاتی کش مکش، وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم اور دیگر سماجی مسائل کے لیے عملی اقدامات کرنے کے متمنی ہیں۔ خاص طور پر غزل کی ساکھ بحال رکھی اور اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے غزل کو نت نئے موضوعات سے روشناس کرایا۔

احمد حسین مجاہد کی شاعری میں مضامین کا تنوع اور حقیقت نگاری بنیادی وصف ہے۔ سماج میں پیش آنے والے مسائل کو جس طرح دیکھا اسے بعینہٖ بیان کر دیا۔ افراد کے درمیان پیش آنے والے مسائل اور کشیدگی کو بڑی ہنر مندی اور بے خوف و خطر ختم کرنے کی کوشش میں محوِ عمل ہیں۔ وہ اپنی عملی زندگی میں جو کچھ دیکھتے ہیں اس کا بیان شاعری کے ذریعے کر دیتے ہیں۔

جہاں کلاسیکی شعرا نے اپنے کلام میں صوفیانہ رنگ، عشقِ حقیقی، جذبۂ حسنِ عشق، غمِ جاناں اور غمِ دوراں جیسے مضامین کو پیش کرتے ہیں، بالکل اسی طرح احمد حسین مجاہد ان روایات کی پاس داری کرتے ہوئے اور روایت کو برقرار رکھتے ہوئے تازگی سے بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں تصوف کا الگ معیار ہے۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی اپنی کیفیت ہے مگر یہاں یہ بات کرنا ضروری ہے کہ ان کی شاعری میں زمانے کا غم اور غمِ دوراں کی چاپ واضح نظر آتی ہے۔ غمِ دوراں میں محض وہ اپنا درد و غم بیان نہیں کرتے بلکہ غریب طبقے کے میر کارواں بن کر ان میں شعور و ادراک لانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ بے مقصد اور بے ڈھنگ موضوعات سے اجتناب کرتے ہوئے عقل و شعور کی گہرائیوں سے کام لے کر الفاظ و جملوں کا بہترین انتخاب کرتے ہیں جو متروک ہونے کے باوجود بھی ان کے کلام میں نادر اور اچھوتے معلوم ہوتے ہیں۔

احمد حسین مجاہد کا کلام رنگا رنگ موضوعات کا غماز ہے۔ عصرِ حاضر میں نت نئی ایجادات اور

ماحول کی مادیت پرستی نے ہر طرف بدنظمی وانتشار پھیلا رکھا ہے۔ شاعر خود بھی اس ماحول کا حصہ ہے۔ اس نے جس زاویۂ نگاہ سے مشاہدہ کیا اور جو محسوس کیا اسے رقم کر دیا۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شاعری ہر طرح کے فکری موضوع وعناصر سے بھرپور ہے جو عہدِ حاضر کے دیگر شعرا میں ایک منفرد منزل کی طرف گامزن ہے۔

فکری رجحانات کے ساتھ ساتھ احمد حسین مجاہد کی شاعری فنی خصائص سے بھی بھرپور ہے۔ ان کا اندازِ بیان، اسلوب اور طرزِ نگارش، دل چسپی کے عمدہ عناصر فراہم کرتے ہیں۔ یہ تمام عناصر بے شمار خوبیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ پڑھنے والے کو دل چسپی کے ساتھ ساتھ تاثیر کے عمدہ نمونے فراہم کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں دورِ جدید کی تہذیب و معاشرت اور نئے لوازمات و تلازمات بہترین عکس مہیا کرتے ہیں۔ صنائع لفظی وصنائع معنوی کو مختلف ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں جو روایتی ہونے کے باوجود بھی نئی معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی شاعری میں منظر نگاری، کلاسیکی رنگ اور رمز و ایمائیت ان کے فن کا بین ثبوت ہیں۔ اخلاقیات کے دامن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ علمِ عروض میں تو احمد حسین مجاہد نے مرکب اور مفرد بحروں کا استعمال کر کے کلام میں ترنم، نغمگیت، موسیقیت اور غنائی وقفے جیسے عناصر عطا کیے ہیں۔ چھوٹی بحریں اور بڑی بحریں ان کے کلام کو مزید خوبصورت اور دل کش بنا دیتی ہیں۔ ان کی شاعری میں سماج سے جڑا ہر پہلو موجود ہے۔ پہلو زندگی کے نصب العین پر منحصر ہے۔

احمد حسین مجاہد کا کلام فنی وفکری رجحانات سے بھرا پڑا ہے۔ یہ فکر و فن جمالیاتی اظہار کے ذریعے پیش کر کے قارئین کو پر لطف اور تعجب خیالات اور سوچ و فکر کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ وہ ہر اک موضوع کو زیرِ بحث لاتے ہیں اور انسان و سماج کی عکاسی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری ہر طرح سے مکمل ہے۔ اگر نظم تخلیق کرتے ہیں تو اس میں ایک سوچ اور جذبے و تخیل کا عمل دخل

ہوتا ہے جس میں وہ آزاد نظم اور پابند نظم دونوں میں حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے ماضی کے دریچوں میں جھانکتے ہیں تو بعض اوقات عصرِ حاضر میں رہتے ہوئے کئی برس آگے چلے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں تجربے کی پختگی اور فکری وفنی ریاضتوں کا بھرپور اظہار ہے۔ ان کی شاعری محض اپنے آپ تک محدود نہیں بلکہ تمام عالمِ انسانیت کی شاعری ہے۔

احمد حسین مجاہد کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے راقم اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ہزارہ کے دیگر غزل گو شعرا میں احمد حسین مجاہد ایک منفرد اور نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری اُردو ازبان و ادب میں بہترین اضافہ ہے۔ وہ ہر طرح کے اسلوبِ بیان اور جدت و ندرت کو سامنے رکھ کر شاعری کو تخلیق کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اس لیے جب تک اُردو زبان و ادب زندہ رہے گا تب تک احمد حسین مجاہد کی شاعری کو اس میں شامل کیا جائے گا۔ جدید شاعر اور منفرد اندازِ بیان کی بدولت احمد حسین مجاہد دیگر ہم عصر شعرا میں نمایاں مقام رکھیں گے۔ جب بھی ہزارہ کے شعرا کی فہرست مرتب ہو گی اس میں اُن کا نام سر فہرست ہو گا اور اُردو زبان و ادب کی ترقی میں ان کا نام بہترین حوالہ رہے گا۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، عکاس پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء
اوک میں آگ، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء

ثانوی مآخذ

آصف ثاقب، در کنار، ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۸ء
اکتفاء، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸
ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء
ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر، جدید شاعری کا ترقی پسند دور، مطبوعہ نگار جدید شاعری نمبر ۱۹۶۵ء
غزل اور متغزلین، اُردو مرکز، لاہو، ۱۹۵۴ء
اثؔر لکھنوی، کلیاتِ اثؔر، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی، س ن
احتشام حسین سید، پروفیسر، اُردو نظم کا فنی و تاریخی ارتقاء، تاج بک ڈپو، لاہور، ۱۹۶۶ء
احمد خان، پروفیسر، مجموعہ مقالات بزم اقبال، مکتبہ جدید پریس شاہراہِ فاطمہ، لاہور، ۱۹۸۳ء
احمد ہمدانی، قصہ نئی شاعری کا، رائل بک کمپنی، کراچی، ۱۹۷۹ء
ارشاد شاکر اعوان، برف کی دیوار، ہزارہ پرنٹنگ پریس، ایبٹ آباد، ۱۹۸۹ء
اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، اصنافِ نظم و نثر، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور، ۲۰۱۴ء
کلیدِ اُردو، کاروان بک ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء
اکرام جمالی، دھوپ دھوپ صحرا، اسد محمود پرنٹنگ پریس، راولپنڈی، اپریل ۲۰۰۲ء

الطاف حسین حالی، خواجہ، مقدمہ شعر و شاعری، پاپولر پبلشنگ ہاؤس، اُردو بازار، لاہور، ۱۹۸۴ء

امان اللہ خان امان، محبت استعارہ ہے، حلقۂ یاراں، شنکیاری، ۱۹۹۷ء

انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، مارچ ۲۰۱۷ء

انیس ناگی، تنقید و شعر، نئی فنی مطبوعات، لاہور، بار اول، اکتوبر ۱۹۹۶ء

ایم دل بفوی، سرن کے موتی، گاؤں بفہ ہزارہ، ۱۹۸۸ء

ایوب صابرؔ، پروفیسر، ادبستان ہزارہ، بزمِ اہلِ قلم مطبع گنج شکر پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۹ء

بشیر احمد سوز، پروفیسر، ہزارہ میں اُردو زبان و ادب کی تاریخ، ادبیات مرکز تحقیق و اشاعت، ۲۰۱۰ء

ہزارہ میں قومی شاعری، حرف اکادمی، راولپنڈی ستمبر ۲۰۰۷ء

بے خود مراد آبادی، یہ زندگی کا کارواں، مجلس علم و ادب راولپنڈی، ۱۹۸۳ء

تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، نئے شعری زاویے، سنگ میل پبلشرز، لاہور، طبع اولیٰ ۱۹۷۸ء

جسارت خیالی، نقدِ سخن، رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی، جولائی ۲۰۱۸ء

حمید اللہ ہاشمی، پروفیسر، بدیع و بیان، مکتبہ دانیا، لاہور، ۲۰۰۱ء

حنیف کیفی، پروفیسر، اُردو میں نظم معرٰا اور آزاد نظم، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، دہلی، ۲۰۰۳ء

حیدر زمان حیدر، ہند کو چار بیٹے، مصطفائی پرنٹنگ پریس، ایبٹ آباد، ۱۹۸۰ء

داؤد کوثر، تذکرہ شعرائے مانسہرہ، سرحد اُردو اکیڈمی، قلندر آباد، ۱۹۹۲ء

سلطان سکون، کوئی ہے، مثال پبلشرز، رحیم سنٹر فیصل آباد، ۲۰۱۶ء

شیر بہادر پنی، ڈاکٹر، تاریخ ہزارہ، مکتبہ جمال، اُردو بازار، لاہور، ۲۰۱۶ء

صوفی عبد الرشید، سرمست، بزم علم و فن، الرحمٰن پبلشرز، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء

عبادت بریلوی، ڈاکٹر، جدید شاعری، ایجوکیشنل بُک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۳ء

عبد الباری، مولانا، کلیاتِ نظیر، نول کشور پریس، لکھنؤ، 1951

فضل اکبر کمال، عکسِ کمال، حرف اکادمی، راولپنڈی، ۲۰۰۵ء

ساحل احمد، اُردو نظم اور اس کی قسمیں، اُردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد، ۱۹۹۷ء

سنبل نگار، ڈاکٹر، اُردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ، دارالنور، لاہور، ۲۰۰۳

سید عابد علی عابد، اسلوب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء

البدیع، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

البیان، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

شکیل الرحمان، پروفیسر، اُردو ادب اور جمالیات، مرتب و تدوین، شیخ عقیل، دہلی، ۲۰۱۱ء

صابر کلوروی، ڈاکٹر، بدیع و بیان، مکتبہ دانیال، لاہور، ۲۰۰۱ء

طارق ہاشمی، شعریاتِ خیبر — عصری تناظر، محمد اکرم عاربی، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء

عندلیب شادانی، دورِ حاضر اور اُردو غزل گوئی، ادارہ فروغِ ادب، لاہور، ۱۹۶۲ء

غلام حسین ذوالفقار، اُردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر، جامعہ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۶ء

فاروق چوہدری، پروفیسر، ڈاکٹر، رموزِ اُردو، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء

فراق گورکھپوری، اُردو غزل گوئی، ادارہ فروغِ ادب، لاہور، ۱۹۵۵ء

کلیم الدین احمد، اُردو شاعری پر ایک نظر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور، س ن

گوہر رحمان نوید، صوبہ سرحد میں اُردو ادب (پس منظر و پیش منظر)، یونیورسٹی پبلشرز، قصہ خوانی پشاور، ۲۰۰۰ء

محب الرحمٰن قاضی، ڈاکٹر، نخلِ آرزو، شعر و سخن پبلی کیشنز، مانسہرہ، ۲۰۰۰ء

محبوب الٰہی عطاء، آئینہ در آئینہ، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء

محمد افضل خان، ایڈوکیٹ، بیاضِ افضل، بزم شعر و سخن پبلی کیشنز، مانسہرہ، فروری ۲۰۰۲ء

محمد حنیف، چراغِ آفریدم، ڈائیلنگ پبلی کیشنز، کراچی، ستمبر ۲۰۰۹ء

محمد خواص خان، سبدِ گل، مجلس علم وادب، راولپنڈی، ۱۹۸۴ء

گلدستہ شعرائے پکھلی، مجلس علم وادب، راولپنڈی، ۱۹۸۳ء

مقرب آفندی، بارود کی خوشبو، راولپنڈی، ۱۹۸۰ء

منیر حیدر، دشمن آسمان اپنا، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء

فصلِ فریب، انجمن ترقی اُردو، ایبٹ آباد، ۲۰۰۴ء

سوچاں تے جگراتے، پاکستان مرکزی ہندکو ادبی بورڈ پشاور، ۱۹۹۶ء

مثل پُھل گلاب، گندھارا ہندکو بورڈ، پشاور، ۲۰۰۸ء

نذیر تبسم، سرحد کے اُردو غزل گو شعرا، تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی شعبہ اُردو، پشاور یونیورسٹی، ۲۰۰۳ء

نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر، دہلی کا دبستان شاعر، بک شاپ لاہور ۱۹۶۵ء

واجد سید رضوی، دانائے راز، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۷ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، اُردو شاعری کا مزاج، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۵ء

نظم جدید کی کروٹیں، میری لائبریری، لاہور، ۱۹۷۴ء

وقار احمد رضوی، ڈاکٹر، تاریخ جدید اُردو غزل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، طبع اول، ۱۹۸۸ء

رسائل و جرائد

جدید ادب، جرمنی، جنوری تا جون ۲۰۰۹ء

فنون، سہ ماہی، لاہور، شمارہ ۱۱۰، جولائی ۱۹۹۹ء

شعر و سخن، مانسہرہ، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۲ء

اخبارات

روزنامہ اُردو لنک، یو ایس اے، اکتوبر ۲۰۰۳ء

انٹرویوز

احمد حسین مجاہد، انٹرویو، ایبٹ آباد، یکم جنوری ۲۰۲۲ء

احمد عطاء اللہ، انٹرویو، ایبٹ آباد، ۱۵ جنوری ۲۰۲۲ء

زوجہ احمد حسین مجاہد، انٹرویو، ایبٹ آباد، ۲۵ جنوی ۲۰۲۲ء

محمد حنیفؔ، انٹرویو، شنکیاری (مانسہرہ)، ۱۰ فروری ۲۰۲۲ء

لغات

اثر لکھنوی، فرہنگ اثر، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء

خواجہ عبد الحمید، جامع اللغات، اُردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۹ء

سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، مرکزی اُردو بازار، لاہور، جون ۱۹۷۷ء

فیروز الدین، مولوی، الحاج، فیروز اللغات، فیروز سنز، کراچی، ۲۰۱۰ء

محمد امین بھٹی، الحاج، اظہر اللغات، اظہر پبلشرز، لاہور، س ن

نور الحسن، مولوی، نور اللغات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۷۶ء

وارث سرہندی، علمی اُردو لغت جامع، علمی کتب خانہ، لاہور، ۲۰۱۲ء